February 2024 فروری

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad
ISSN: 2581-9216

خصوصی شمارہ

چلتی پھرتی ہوئی آنکھوں سے اذاں دیکھی ہے
میں نے جنت تو نہیں دیکھی ہے ماں دیکھی ہے

منور رانا

پیدائش: 01, Nov. 1952
وفات: 14, Jan. 2024

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد حامد ہلال اعظمی

قیمت: -/20 روپے

www.shibliinternational.com

ماہنامہ
حیدرآباد

صدائے شبلی

Monthly Hyderabad

SADA E SHIBLI

فروری Feb 2024 جلد: Vol: 6 شمارہ: Issue: 72

ISSN: 2581-9216

مدیر:

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران:

ڈاکٹر عبدالقدوس

ڈاکٹر سراج احمد انصاری

ابوہریرہ یوسفی

قیمت فی شمارہ:	20/-
سالانہ:	220/-
رجسٹرڈ ڈاک:	350/-
بیرونی ممالک:	50/- امریکی ڈالر
خصوصی تعاون:	2000/-

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661 - 8317692718

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ۔ پروفیسر مظفر علی شہہ میری
پروفیسر محسن عثمانی ندوی ۔ پروفیسر ابوالکلام
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی ۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
مفتی محمد فاروق قاسمی ۔ مولانا ارشادالحق مدنی
ڈاکٹر نادر المسدوسی، مولانا محمد مساعد ہلال احیائی
اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ ۔ محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق ۔ ڈاکٹر حمران احمد ۔ ڈاکٹر ناظم علی
ڈاکٹر مختار احمد فردین ۔ ڈاکٹر غوثیہ بانو
ڈاکٹر سید امام حبیب قادری ۔ ڈاکٹر سید اسرارالحق سبیلی
ڈاکٹر سمیہ تمکین ۔ ڈاکٹر صالحہ صدیقی ۔ ڈاکٹر نوری خاتون
ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
ڈاکٹر آصف لئیق ندوی ۔ ڈاکٹر مظفر علی ساجد۔
مولانا عبدالوحید ندوی ۔ مولانا احمد نورعینی
ابوہریرہ ایوبی ۔ محسن خان

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط وکتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352,
B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Dabirpura Road, Purani Haveli,
Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	**اداریہ**: وہ منور ہی رہے گا	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	**صالحیت**	مولوی حبیب الرحمٰن	۷
۴	عمر بھر دھوپ میں پیڑ جلتا رہا-منور رانا	علامہ اعجاز فرخ	۱۰
۵	**قطعات**	فرزانہ پروین	۱۲
۶	میری محبوب میری ماں: منور رانا	ڈاکٹر صالحہ صدیقی	۱۳
۷	**"غمِ ہجراں"**	ولی محمد زاہد ہریانوی	۱۶
۸	منظر سے منور تک	ابن نثار	۱۷
۹	**غزل**	مظفر شہ میری	۲۲
۱۰	اردو شاعری کا مینارۂ نور: منور رانا	اسامہ ارشاد معروفی قاسمی	۲۳
۱۱	منور رانا کے شعر وادب میں تصور موت وحیات	رفیعہ نوشین	۳۱
۱۲	منور رانا کی شاعرانہ عظمت	ڈاکٹر رضیہ دانش	۳۴
۱۳	ڈاکٹر اسلم پرویز کی ہمہ جہت شخصیت وخدمات (۱)	علیزے نجف	۳۷
۱۴	ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد کا خصوصی شمارہ "مسرور عابدی" کی....	ادارہ	۴۰

ماہنامہ "صدائے شبلی" کے خصوصی معاونین

جناب **ابوسفیان اعظمی**، مقیم حال ممبئی

جناب **محمد یوسف** بن الحاج محمد منیر الدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد

مفتی **محمد فاروق قاسمی**، صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھرا پردیش

ڈاکٹر **سید جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد

مولانا **منصور احمد قاسمی**، معین آباد، تلنگانہ

الحاج **رئیس احمد اقبال**، انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی، حیدرآباد

الحاج **محمد زکریا** انجینئر (داماد استاذ الاساتذہ حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ)

ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد

مولانا **محمد عبدالقادر سعود**، نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد

الحاج **محمد قمر الدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

الحاج **محمد عبدالکریم**، صدر مسجد اشرف کریم کشن باغ، حیدرآباد

ادار یہ

وہ منور ہی رہے گا

ہمارا یہ شمارہ ۷۲واں ہے، جب ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد کے پہلے شمارے کے ٹائٹل پر یحییٰ اعظمی کا یہ شعر لکھا گیا۔

کہیں صدیوں میں ہوتا ہے یہ فیض خاص ربانی
نہیں اٹھتے ہمیشہ دہر میں شبلی نعمانی

جس نے پڑھا اور دیکھا ہمارے اس شمارے کو پسند کیا، آج ادارہ خوشی محسوس کر رہا ہے کہ ہم نے ان چھ سالوں میں شبلی کی صدا کو ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا الحمدللہ، ماہنامہ صدائے شبلی ابتدا ہی سے اللہ کے فضل، علماء، ادباء اور شعراء کے تعاون سے ارتقاء کے مراحل میں داخل ہو گیا، ماہنامہ صدائے شبلی میں شائع مضامین وتخلیق معیاری ہوتے ہیں جو اہل علم ودانش کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ایں سعادت بزور بازو نیست ۔تانہ بخشد خدائے بخشندہ۔ ہمارے ان چھ سالوں میں ہمارے اس رسالے کے لئے بہت سے معاونین ہیں، ادارہ سبھی کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہے بالخصوص ماہر شبلی ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی کا قلمی تعاون نمایاں رہا، خداوند قدوس ڈاکٹر صاحب کو صحت وتندرستی کے ساتھ تادیر سلامت رکھے، آمین۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے ماضی کے کئی سالوں میں ماہنامہ صدائے شبلی کی 150 کاپیاں ملک بھر کے مختلف لائبریریوں میں قیمتاً ارسال کرواتی رہی جس کی وجہ سے ہمارے رسالے کو جانبین سے فائدہ ہوا اور قومی کونسل سے ہر تین ماہ میں ایک خاطر خواہ رقم موصول ہوتی رہی، یہ اردو کے فروغ کی اہم خدمت ہے، ادارہ اس تعاون پر قومی کونسل کا شکریہ ادا کرتا ہے،لیکن حال میں یہ معاونت کو اردو کے رسائل کے لئے مسدود کر دی گئی۔ادارہ مرکزی حکومت اور قومی کونسل کے ذمہ داروں سے گزارش کرتا ہے کہ یہ معاونت کا معاملہ حسب سابق باقی رکھیں یا اس سے بہتر کوئی انتظام کریں۔

ہمارا یہ فروری ۲۰۲۴ء کا شمارہ ملک اور بیرون ملک کے ممتاز شاعر منور رانا پر مخصوص ہے، منور رانا کا پورا نام سید منور علی ہے، وہ ۲۶ ؍نومبر ۱۹۵۲ء رائے بریلی یوپی میں پیدا ہوئے، ان کا بچپن اور شباب نشیب وفراز سے عبارت ہے، وہی پس منظر ان کی شاعری بن کر لفظوں کے پیکر میں چھلکتا ہے، خدا نے انہیں جسم کی توانائی کے ساتھ آواز میں قوت دے رکھی تھی۔ جب وہ اپنے خیالات وتصورات ومشاہدات کو شعری پیکر میں ڈھالتے اور پڑھتے تو لوگ آہ اور واہ پر مجبور ہو جاتے، انہوں نے اپنی شاعری میں ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جسے اردو والے خاطر میں بھی نہیں لاتے تھے۔انہوں نے محبوب رشتے، کمزور، مظلوم کی آواز کو، غزل میں دلیری اور برجستگی سے پیش کیا ہے، منور رانا کئی اہم اداروں سے وابستہ رہے اور مختلف عہدوں پر فائز بھی رہے۔ نیز وہ اہم اعزازات سے بھی نوازے گئے۔ان کے کئی اردو شعری مجموعے، ہندی شعری مجموعے اور نثری تصانیف منظر عام پر آئیں۔ خواص وعوام اہل علم ودانش نے منور رانا کی شاعری کو شاعر ہی کی طرح پڑھا اور قدر ومنزلت کی اور ان کے بہت سے اشعار زبان زد ہیں، جیسے وہ کہتے ہیں۔

کسی کو گھر ملا حصہ میں یا کوئی دکاں آئی ☆ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا مرے حصے میں ماں آئی

سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اخبار بچھا کر ☆ مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

منور رانا کی حیات کا سفر رائے بریلی سے شروع ہو کر بنگال میں پھل پھول کر اودھ کی راجدھانی لکھنؤ میں 71 سال کی عمر میں 14 جنوری 2024 کو اختتام پزیر ہوا۔اور ان کی فکر شاعری کی شکل میں کرنیں بکھیرتی رہیں گی، جو انھیں پسِ مرگ زندہ ہونے کی یاد دلاتی رہے گی، ادارہ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ ان کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور ان کے اہل خانہ پسماندگان سے تعزیت کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ منور رانا کی خدائے ذوالجلال مغفرت اور جنت الفردوس عطا فرمائے آمین۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس کہیں سے کپڑے آئے جن میں ایک سیاہ چادر بھی تھی، جس میں دونوں طرف آنچل تھے، آپ ﷺ نے حاضرین سے کہا یہ چادر کس کو دوں، لوگ چپ رہے، آپ ﷺ نے فرمایا ''ام خالدؓ کو لاؤ'' وہ آئیں تو آپ ﷺ نے ان کو پہنایا اور دو دفعہ فرمایا ''پہننا اور پرانی کرنا'' چادر میں جو بوٹے تھے، آپ ﷺ ان کو دکھا دکھا کر فرماتے تھے، ام خالدؓ دیکھنا یہ سناہ ہے یہ سناہ ہے۔ اوپر گذر چکا ہے کہ ام خالدؓ حبش میں پیدا ہوئی تھیں اور کئی مہینے تک وہیں رہی تھیں، اس لیے ان سے حبشی زبان میں خطاب کیا۔

ایک صحابی کا بیان ہے کہ بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا تھا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجھ کو خدمتِ اقدس میں لے گئے، آپ ﷺ نے پوچھا ڈھیلے کیوں مارتے ہو، میں نے کہا کھجوریں کھانے کے لیے، ارشاد فرمایا کہ کھجوریں جو زمین پر ٹپکتی ہیں، ان کو اٹھا کر کھالیا کرو، ڈھیلے نہ مارو، یہ کہہ کر سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔

ماں بچے کی محبت کے واقعات سے آپ ﷺ پر سخت اثر ہوتا تھا، ایک دفعہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی، دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی ساتھ تھیں، اس وقت حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ نہ تھا، ایک کھجور زمین پر پڑی ہوئی تھی، وہی اٹھا کر دے دی، عورت نے کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور دونوں میں برابر تقسیم کر دیا، آنحضرت ﷺ باہر سے تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ سنایا، ارشاد فرمایا ''خدا جس کو اولاد کے محبت میں ڈالے اور وہ ان کا حق بجالائے وہ دوزخ سے محفوظ رہے گا۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے، میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ ہوتا ہے کہ دیر میں ختم کروں گا، دفعتاً صف سے کسی بچہ کے رونے کی آواز آتی ہے اور مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں کو تکلیف ہوتی ہوگی۔

(یہ محبت اور شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی، بلکہ مشرکین کے بچوں پر بھی اسی طرح لطف فرماتے تھے، ایک دفعہ ایک غزوہ میں چند بچے جھپٹ میں آکر مارے گئے، آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو نہایت آزردہ ہوئے، ایک صاحب نے کہا یا رسول اللہ ﷺ وہ مشرکین کے بچے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا ''مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے''۔

معمول تھا کہ جب فصل کا نیا میوہ کوئی خدمت اقدس میں پیش کرتا تو حاضرین میں جو سب سے زیادہ کم عمر بچہ ہوتا، اس کو عنایت فرماتے۔ بچوں کو چومتے اور ان کو پیار کرتے تھے، ایک دفعہ آپ ﷺ اسی طرح بچوں کو پیار کر رہے تھے کہ ایک بدوی آیا، اس نے کہا ''تم لوگ بچوں کو پیار کرتے رہو، میرے دس بچے ہیں، مگر اب تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا'' آپ ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ اگر تمہارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں''۔

جابرؓ بن سمرہ صحابی تھے، وہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ اپنے گھر کی طرف چلے، میں بھی ساتھ ہولیا کہ ادھر سے چند اور لڑکے نکل آئے، آپ ﷺ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا۔

(سیرۃ النبیؐ، جلد: دوم، ص: ۳۰۲-۳۰۳)

مولوی حبیب الرحمن۔حیدرآباد

صالحیت

4۔"وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا" (النساء:142) ترجمہ: (اور اللہ کا ذکر (یعنی ذکرِ آخرت) بہت کم کرتے ہیں (یعنی رات دن صرف دنیا اور دنیا ہی کی باتوں میں مصروف رہتے ہیں)

5۔ "مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ ق لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ" (النساء:143) کفر و اسلام کے درمیان معلق' نہ ادھر نہ ادھر' ہوا کے رخ پر چلنے والے' پانی کے دھارے پر بہنے والے باطل کا فروغ دیکھا تو باطل کے ساتھ' حق کا فروغ دیکھا تو حق کے ساتھ۔

6۔ "یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْکَرِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ" (سورہ توبہ: 67) کفر و مخالفتِ اسلام کی تعلیم دیتے ہیں۔ اچھی بات یعنی ایمان باللہ و اتباع و اطاعت نبوتؐ سے منع کرتے ہیں۔ یعنی ہر اس کام کی طرف بلاتے ہیں جس میں صرف دنیا ہی کا فائدہ ہو۔

7۔ "یَقْبِضُوْنَ اَیْدِیَھُمْ" (سورہ توبہ: 67) اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے جی چراتے ہیں اور اگر خرچ بھی کرتے ہیں تو بڑی کراہیتِ قلبی کے ساتھ۔ "وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَھُمْ کٰرِھُوْنَ" (سورہ توبہ: 54).

8۔ "اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ" (سورہ توبہ: 67) ہمیشہ نافرمانی کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنی حالت پر کوئی شرم و ندامت محسوس نہیں کرتے۔

9۔ اللہ و رسولؐ کے ساتھ استہزاء کرتے یعنی دین کی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ بھی نفاق ہی کی علامت ہے۔ "قُلْ اَبِاللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ وَرَسُوْلِہٖ کُنْتُمْ تَسْتَھْزِءُوْنَ" (سورہ توبہ: 65) یہ خطاب منافقین ہی سے ہے۔ حدیث رسولؐ میں بھی چار علامتیں بیان کی گئی ہیں۔ "وعن عبداللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اربع من کن فیہ کان منافقًا خالصًا ومن کانت فیہ خصلۃ منھن کانت خصلۃ من النفاق حتٰی یدعھا اذا ؤتمن خان واذا حدث کذب واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر" (متفق علیہ) ترجمہ: (عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار باتیں ہیں جس میں وہ چار ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس شخص میں اس میں سے کوئی ایک بات ہو اس میں نفاق کی ایک خصلت پائی جاتی ہے۔ جب تک اسے چھوڑ نہ دے (1) جب امانت سپرد کی جائے خیانت کرے (2) گفتگو میں جھوٹ بولے (3) معاہدہ میں بدعہدی کرے (4) لڑائی میں گالی گلوچ کرے۔) اس حدیث میں نفاق سے بچنے کی تاکید ہے اور یہ تنبیہ بھی ہے کہ ان چاروں خصلتوں سے جب تک توبہ نہ کی جائے مرضِ نفاق دور نہیں ہوتا۔ مسلم میں ابوہریرہؓ کی روایت میں اتنا اور اضافہ ہے۔ "وان صام و صلی وزعم انہ مسلم" ترجمہ: (اگرچہ روزہ رکھتا ہو' نماز پڑھتا ہو اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔) مطلب یہ ہے کہ

نماز، روزہ سے اس دھوکہ میں نہ رہیں کہ ہم مومن ہیں بلکہ اس مرض قلبی کا پتہ لگا کر اس سے بچتے رہنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق کی ایک علامت یہ بھی بیان فرمائی ہے۔ ”وان المنافق اذا مرض ثم اعفی کان کالبعیر عقلہ اھلہ ثم ارسلوا فلم یدرلم عقلوہ ولم ارسلوہ“ (ابوداؤد) ترجمہ: (منافق بیمار ہونے کے بعد اچھا کر دیا جاتا ہے وہ اس اونٹ کے جیسا ہوتا ہے جس کو اس کے مالک نے باندھا اور پھر چھوڑ دیا اس کو نہیں معلوم کہ کیوں باندھا تھا اور کیوں چھوڑ دیا۔) یعنی یہ غور نہیں کرتا کہ یہ مصیبت کیوں آئی اور کیوں چلی گئی۔ مصیبت کے بعد بھی اپنی اصلاح کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ دنیا میں انسان پر جو مصیبتیں نازل ہوتی رہتی ہیں وہ اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے بھی نازل ہوتی ہیں۔ نافرمانوں پر مصیبت اس لئے نازل کی جاتی ہے کہ وہ چونکیں لہٰذا ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان مصیبتوں میں اولاً اصلاح حال کی طرف متوجہ ہو اور نفاق یہ ہے کہ اس کا احساس بھی نہ ہو بلکہ مصیبت آنے سے چین بجین ہو کر اللہ تعالیٰ کی شکایتیں کرنے لگے۔ نبی معلم حکمت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پُر از حکمت ارشاد میں اسی طرف اشارہ ہے کہ خیانت، بدعہدی، دروغ بیانی، فحش کلامی جیسے گناہوں کا مرتکب اپنے ایمان میں سچا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ مالی نفع اندوزی اور جان و مال کے نقصان سے محفوظ رہنے کا ذریعہ اس نے ان ہی گناہوں کو بنا رکھا ہے۔ نفاق کی جزا بھی نار ہے بلکہ جہنم کا سب سے نچلا طبقہ۔ ”اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج (النساء:145) شرک، کفر ونفاق بے شک وہ خطرناک امراض ہیں جو شجر ایمان کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں مگر یہ خطرناک امراض جس فاسد مادہ سے پیدا ہوتے ہیں، وہ حبِّ دنیا ہے (یعنی دنیا کے نفع کو آخرت کے نفع پر ترجیح دینا اور انجام سے غافل رہنا دنیا کی محبت ہے۔)” ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ لا“ (سورہ النحل: 107) ترجمہ: ((ان لوگوں کے کفر وشرک وغیرہ میں مبتلا ہونے کی) وجہ یہ ہے کہ انہوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو پسند کیا۔) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی فرماتے ہیں کہ ہر چھوٹی بڑی خطاء کی جڑ دنیا کی محبت ہے ”حب الدنیا رأس کل خَطِیْئَۃٍ“۔

ایمان باللہ

سطور بالا میں شرک کی جو مختصر تشریح کی گئی ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ انسان جہل کی وجہ سے اپنا عارضی وابدی نفع وضرر مخلوق کے اختیار میں سمجھ کر خوشی سے ان کے آگے سرنگوں، سربسجدہ ہو جاتا ہے ان کو خوش وراضی رکھنے کے لئے ان کی مرضی و ہدایت کی اتباع کرتا ہے۔ ان میں حاجت روائی، مشکل کشائی، کارسازی کا اختیار ثابت کر کے مشکلات وحاجات میں ان ہی کی طرف رجوع کرتا ہے اور ہر حیرانی و پریشانی میں مدد کے لئے پکارتا ہے، ان ہی کی نذر ومنت کرتا ہے، ان کے نام کی کچھ علامتیں بنا کر (جیسے پتھر کی مورتی یا عَلَم یا جھنڈے) ان کی تعظیم کرتا ہے یا ان کی قبور پر سجدے اور ان کا طواف کرتا ہے۔ اس طرح ان سے اپنی عقیدت اور اپنی نیاز مندی کا اظہار کرتا ہے اور ان کی ناراضگی سے ڈرتا ہے چاہے وہ ملائکہ ہوں یا اجنّہ، انبیاء علیہم السلام ہوں یا اولیاء کرام یا ملوک وسلاطین یا احبار ورہبان (مذہبی پیشوا) ہوں اور یہ کہ اپنی زندگی کا خود کو مالک ومختار سمجھ کر ہوا وہوس، نفسانی خواہشات کی من مانی پیروی کرتا ہے اور اپنی زندگی کے آئین وقوانین خود مرتب کرتا ہے۔ یہ سب غیر اللہ کو اور اپنی ہویٰ کو

الٰہ بنانا ہے، غیر اللہ کی پرستش اور اپنی خواہشات کی بندگی و اتباع ہے، یہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہے، اللہ تعالیٰ کو خالق و رب مان کر اللہ تعالیٰ کا انکار ہے اور اللہ تعالیٰ کی عارضی وابدی رحمتوں سے دور کردینے والی گمراہی "ضـلالًا بعیدا" ہے۔ کلمۂ طیبہ "لا الـه الا الله" کے ذریعہ جاہل و نادان انسان کو یہ علم وآگہی بخشی گئی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا زمین وآسمان میں کوئی فردِ خلق الٰہ نہیں ہے اور نہ انسان اپنی زندگی کا مالک ومختار ہے بلکہ انسان اور انسان کے تمام خود ساختہ الٰہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں انسان کی عارضی وابدی زندگی کا نفع وضرر کسی فردِ خلق کے اختیار میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ مخلوقات میں نفع وضرر، منع و عطاء، ذلت وعزت، ہدایت وضلالت وغیرہ کی جو قابلیتیں بظاہر نظر آتی ہیں اور خود انسان میں سننے، دیکھنے، سمجھنے، کام کاج کرنے کی جو قوتیں ہیں اور تصرّف واختیار کی جو قابلیت ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا ہیں جو اللہ تعالیٰ کے توجہ وارادہ سے ہر آن جاری وساری ہے۔ اللہ جل شانہٗ جس قوت وقابلیت کو جس وقت چاہیں چھین لیں۔ اللہ تعالیٰ ضرر پہنچانا چاہیں تو اللہ ہی کے سوا کوئی اس کو دفع نہیں کرسکتا اور اللہ تعالیٰ نفع پہنچانا چاہیں تو کوئی روک نہیں سکتا۔ "وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ" (سورہ یونس:107) ترجمہ: (اگر تم کو اللہ تعالیٰ تکلیف پہنچائے تو بجز اس کے کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تم کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں۔) اور یہ کہ جس طرح انسان کی بقاءِ حیات، رہنے سہنے، کھانے پینے، سونے جاگنے وغیرہ کی فطری خواہشات، اللہ جل شانہٗ خالقِ فطرت کے مقررہ نظامِ حیات کی کماحقہٗ اتباع سے پوری ہورہی ہیں۔ اسی طرح انسان کی یہ جو فطری خواہش ہے کہ اس کو اس زندگی میں خوف وحزن دامن گیر نہ رہے اس کے افکار و اعمال میں حسن وخوبی، صالحیت و پاکیزگی پیدا ہو، تاکہ وہ اپنے فطری تعلقات کو اچھی طرح، لڑائی جھگڑے کے بغیر قائم رکھ سکے۔ ہر ایک کے حقوق، عدل واحسان کے ساتھ ادا کرسکے اور اس کو ایک لازوال، اعلیٰ، حسن وکمال، راحت وشادمانی کی زندگی حاصل ہو تو یہ فطری خواہشات بھی اسی وقت پوری ہوسکتی ہیں جبکہ انسان اللہ تعالیٰ کی مرضی وہدایت کی پوری پوری اتباع کرے یعنی انسان کی عارضی وابدی زندگی میں خیر وخوبی، حسن وکمال اور اس کو بقاء ودوام بھی اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے فیضان ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی واطاعت کے بعد اللہ تعالیٰ کی توجہ سے یہ فیضانِ حق انسان میں جاری ہوجاتی ہے (جیسا کہ قانونِ رحمانیت وقانونِ رحیمیت کے ساتھ ساتھ قدرتِ الٰہی کے ظہور ومشاہدات بھی شامل ہیں) پس اللہ تعالیٰ ہی الٰہ واحد ہیں۔ معبود ومستان ہیں۔ "اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى" (سورہ طٰہٰ:8) انسان کو زندگی اور زندگی گزارنے کا پورا پورا سامانِ حیات، اللہ تعالیٰ ہی نے عطا کیا ہے، اللہ تعالیٰ ہی انسان کو صحیح وفطری راہ عمل کی تعلیم دینے والے اور فطری وغیر فطری، صحیح وغلط افکار و اعمال کی ابدی جزاء دینے کے لئے انسان کو مرنے کے بعد زندہ کرکے اپنے روبرو حاضر کرنے والے ہیں۔ اس لئے دنیا وآخرت میں حمد ہے تو ان ہی کے لئے ہے اور اصلی وحقیقی حکومت ہے تو ان ہی کی حکومت ہے۔ ایسی حکومت جس میں انسان ہی کی حاجت روائی وکارسازی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ہی الٰہ واحد ہیں۔ (ماخوذ: رہنمائے فطرت، ص:۹۶-۱۰۱)

علامہ اعجاز فرخ۔حیدرآباد

عمر بھر دھوپ میں پیڑ جلتا رہا۔منور رانا

ایک حقیقت افروز اور مایوس کن قول نے زندگی بھر آزردہ رکھا۔ یونان میں کسی فلسفی نے کہا تھا، شاید ارسطو نے یا افلاطون نے یا سقراط نے۔اس نے کہا تھا ''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا''اس حقیقت کا اظہار میں نے بارہا کیا اور اس سچ پر جھٹلایا گیا۔جھٹلانے کی وجہ نہ یہ قول ہے نہ میرا وجود بلکہ جھٹلانے کی وجہ یہ ہے کہ اگر میرے اس سچ کو نہ جھٹلایا جائے تو میری صف میں وہ تمام اندھے جو رقص کی تعریف کر رہے ہیں۔ وہ تمام بہرے جو موسیقی کی نہ صرف داد دے رہے ہیں بلکہ ان کی داد سر رس کا ساتواں در کھول رہی ہے۔ وہ گونگے جو ایوان خطابت میں اپنی خطابت کا رس گھول رہے ہیں اور وہ بونے جو قد آوروں کا قد ناپ رہے ہیں، وہ جاہل جن کی ماؤں نے اپنی محبت سے میرے نام کے جز کی طرح اپنی اولادوں کو علامہ کہا، سب معرض بحث میں آجائیں گے۔میں تو تمام عمر اس عقدہ کشائی میں گم رہا کہ میں ہوں بھی یا نہیں، مگر فرانسیسی مفکر Descartes جسے دیکارتے کہا جاتا ہے، اس نے مشکل حل کردی کہ میری فکر نے میرے وجود سے سرگوشی کی کہ ''میں'' ہوں۔جب عالمی اردو کانفرنس کے حوالے سے مجھے ادب کی ان نامور ہستیوں پر لکھنے کے لئے کہا جاتا ہے تو میرا سراپا ایک عکس فریادی سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتا کہ کہاں شعر و ادب کی عظیم بلندیاں اور میری کوتاہ قامتی اور پھر اردو کے صنم کدے میں غزل جیسی کافر ادا، جو عیاں بھی، نہاں بھی، پردہ نشین بھی، جلوہ افروز بھی، اس کی بحروں کی حشر سامانیاں۔قوافی و ردیف کی قیامت خیزیاں، مضمون آفرینی کی توبہ شکن انگڑائیاں، صنائع کی قیامت خیزیاں۔ایسے میں کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔

غزل میں دنیا سے محبت کے کچھ ادھ سنے راگ سنائی دیتے ہیں اور تمام حقیقت محسوسات اور وجدانی تجربات کی الگ الگ آوازیں ہوتی ہیں۔شاعر کی انفرادیت ان محسوسات اور تجربات کی خلاقی میں ایک مرکزی عنصر ہے۔ان محسوسات و تجربات کے بقیہ عناصر روایتوں اور ان فضاؤں کے ہاتھوں بنتے ہیں۔منور رانا کی آواز جدید اردو غزل میں نئی اور منفرد آواز ہے۔یہ آواز وجدانی ہوتے ہوئے بھی غیب سے نہیں اتری بلکہ زمینی آوازوں ہی کی مدد سے انہوں نے اپنی آواز تخلیق کی ہے۔

ان کی شاعری طرز احساس کے نئے تن، انداز و آہنگ کی جدت کے باوصف کلاسیکی رنگ و آہنگ سے الگ نہیں ہو پائی۔ قدامت کی کوکھ سے ندرت خیال کو پیدا کرنے کا سلیقہ ان کے یہاں بڑے خوبصورت انداز سے ملتا ہے اور اس سلیقے سے انہوں نے اس طرح کام لیا ہے کہ اپنے سامنے کھڑی دنیا اور اس کے نشیب و فراز سے آنکھ ملائے رکھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعرانہ نہج کی انفرادیت کو کسی نام سے موسوم کرنے کی کوشش کیجیے تو کوئی نام تو ذہن میں نہیں آتا، لیکن بُعد یک قربت اور ہر قربت میں ایک بُعد کے ساتھ یہ احساس ضرور ملتا ہے کہ جس کو ٹوٹ کے چاہا اسے نہ کھویا ہے نہ پایا ہے۔کبھی کسی شب کے سناٹے میں منور رانا کی شاعری کے لفظ تحلیل ہو جاتے ہیں جیسے آوازیں سناٹے میں بدل جاتی ہیں تو احساس کے شبستان میں کبھی روشنی اور کبھی جھلملاہٹ کی نرمی یہ سوچنے لگتی ہے کہ چراغ دل کو یہ کون جلائے ہے یہ کون بجھائے ہے۔

غزل کے بارے میں مولوی امداد امام اثر کی طرح یہ دعویٰ کرنا تو آسان ہے کہ ''چوں کہ وارداتِ قلبی اور کوائفِ ذہنی کی

کوئی حد وانتہا نہیں اس لیے غزل کا دائرہ بھی محدود ہوتے ہوئے بھی انتہائی وسیع ہے لیکن اس دائرے کو تنگنائے غزل میں اس طرح سمیٹنا کہ زندگی کے انتہائی مشکل مسائل اور عقدہ ہائے دشوار بھی طبع غزل پر بار نہ گزریں، ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ ظاہر میں تو غزل اتنی آسان صنف دکھائی دیتی ہے کہ ہر مبتدی اسی سے اپنی شاعری شروع کرتا ہے اور یہ شیشہ بدن، ہر جور و ستم سہہ جاتی ہے لیکن حقیقتاً غزل گوئی کا فن اس قدر دشوار ہے کہ ہر شاعر کو نمایاں مقام حاصل ہونا مشکل ہے۔ بقول غالب

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

آج غزل زندگی کی ہر تلخ حقیقت، ذہنی الجھن، دل کی دھڑکن، سماج کی پیچیدہ کیفیت اور روح کی بے تابی کی صورت گری میں پیش پیش ہے۔ استعارہ اگرچہ کہ بڑی حد تک معاون ثابت ہوتا ہے لیکن جب تک توفیق نہ ہو بس کی بات بھی نہیں ہے۔ منور رانا کوئی ضرورتاً شاعر نہیں ہیں، وہ طبعاً بلکہ بہ اعتبار جبلت شاعر ہیں۔ آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے لیکن اس کا معصوم بچپن ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ رہتا ہے۔ بچپن لاکھ غربت میں سہی منور رانا کی نظر میں راج سنگھاسن سے کم نہیں اور یہ حقیقت بھی ہے۔ بال ہٹ اور راج ہٹ دونوں مقابلے میں کھڑے ہوں تو بال ہٹ کے آگے راج ہٹ بھی سپر ڈال دیتی ہے۔ بتریا ہٹ کے آگے تو شاعر خود سپر د ہے اس لئے میں اسے موضوع نہیں بناؤں گا ویسے شاید دکن ہی کے کسی شاعر نے کہا ہے کہ

یہ ترا حسن عنایت ہے مری نظروں کی
ورنہ تو شعلہ رخ و شعلہ بدن، کچھ بھی نہیں

کہہ نہیں سکتا کہ کیا یہ واقعی حقیقت ہے یا شاعر نے یگانہ کی طرح اپنے تفوق کے اظہار محض کی خاطر یہ شعر کہا ہے۔ اظہارِ تفوق اور پندارِ انا کی خاطر تو اس قبیل کے شاعر کو انیس کے کلام پر اصلاح بھی دیتے دیکھا یہ جنون صنعت قد آوری ہے یا احساسِ کمتری، اتنی نچلی سطح پر پہنچ کر نقد کرنا ایک لاحاصل سعی ہے۔ منور رانا ایک Self Made انسان ہیں۔ بچپن کے تعلق سے انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی ماں بتاتی تھی کہ انہیں سوکھے کی بیماری تھی، ماں کو یہ بتانے کی ضرورت کیا ہے، دراصل ان کے اندر کا آدمی آج تک بیماری سے بھی اپنا رشتہ نباہتا آ رہا ہے۔ ان کی زندگی کا ہر کنواں خشک ہے۔ آرزو کا، دوستی کا، محبت کا، وفاداری کا، منور رانا جب ہنستے ہیں تو وہ دراصل اندر کا آدمی ہنستا ہے۔ ان کی ہنسی خود بقول ان کے ''انشاء'' کی کھوکھلی ہنسی اور ''میر'' کی خاموش اداسی سے ملتی جلتی ہے۔ ان کے موضوعات میں بچپن معصوم بھی ہے دلخراش بھی۔ پیوند کی طرح چمکتی ہوئی روشنی میں نظر آتے ہوئے بجھے بجھے چہرے، چہروں پر لکھی داستانیں۔ داستانوں میں چھپا ہوا ماضی، ماضی میں چھپا ہوا بچپن، جگنوؤں کو چنتا ہوا بچپن، تتلیوں کو پکڑتا ہوا بچپن، پیڑ کی شاخ سے جھولتا ہوا بچپن، کھلونوں کی دو کانوں کو تکتا ہوا بچپن، باپ کی گود میں ہنستا ہوا بچپن، ماں کا پھٹا آنچل اوڑھ کر سوتا ہوا بچپن، مدرسہ میں سپارے رٹتا ہوا بچپن، جھیل میں تیرتا ہوا بچپن، دھول مٹی سے سنورتا ہوا بچپن، شام کے وقت ننھے ننھے ہاتھوں سے دعا مانگتا ہوا بچپن، غلیل سے نشانے لگاتا ہوا بچپن، پتنگ کی ڈور سے الجھا ہوا بچپن۔ ریت بھی موجود ہے۔ ندی بھی گنگنا رہی ہے لیکن اس کے کنارے گھروندے بنانے والا بچپن چھن گیا جو دھوپ کو چاندنی سے زیادہ حسین کر دیتا ہے۔ منور رانا کو یہ احساس بھی شدید ہے کہ ماں نے تو اپنے آنچل میں بیٹے کو محفوظ رکھا لیکن غریبی کے تیز جھکڑوں نے ماں کے خوبصورت چہرے کو جھلسا جھلسا کر سانولا کر دیا۔ اسی لیے منور رانا کی شاعری میں ماں، بیٹا، بیٹی، بھائی، بہن، دوست، کثرت سے یہ موضوعات ملتے ہیں۔ ان کے نقاد ان موضوعات پر کہے ہوئے اشعار کو Emotional Blackmailing کہتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اسکی وضاحت کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ آئن اسٹائن کی Theory of Relativity جب بہت مشہور ہوئی تو ایک دن کار میں سفر کرتے ہوئے اس کی پوتی نے اس سے پوچھا کہ

میرے کالج کی سہیلیاں مجھ سے کہتی ہے کہ تمہارے دادا بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت مشہور اور بہت قابل احترام لوگ ہر جگہ ان کی Theory of Relativity کی بات کرتے ہیں۔ پلیز کیا آپ مجھے بتلائیں گے کہ یہ RELATIVITY کیا ہے۔ آئن اسٹائن نے مسکرا کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور پھر اس کا ماتھا چوم کر کہا ''جب میں تمہارے باپ سے پانچ منٹ بات کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ان سے ایک گھنٹے سے ہمکلام ہوں میں اور جب میں تم سے ایک گھنٹہ باتیں کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ ابھی دو پل بھی نہیں گزرے۔ نہیں معلوم آئن اسٹائن کیا کہہ رہا ہے۔ نہیں معلوم منور رانا غزل میں کیا کہتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ان کے نقادوں کی کیا رائے ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔

میں نے روتے ہوئے پونچھے تھے کسی دن آنسو
مدتوں ماں نے نہیں دھویا دوپٹہ اپنا

تار پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کو سوتا دیکھ کر
فرش پر سوتا ہوا بیٹا بہت اچھا لگا

پرانا پیڑ بزرگوں کی طرح ہوتا ہے
یہی بہت ہے کہ تازہ ہوائیں دیتا ہے

کسی کے پاس آتے ہیں تو دریا سوکھ جاتے ہیں
کسی کی ایڑیوں سے ریت میں چشمہ نکلتا ہے

دیکھ لے ظالم شکاری ماں کی ممتا دیکھ لے
دیکھ لے چڑیا ترے دانے تلک تو آ گئی

اگر اسکول میں بچے ہوں گھر اچھا نہیں لگتا
پرندوں کے نہ ہونے سے شجر اچھا نہیں لگتا

فرزانہ پروین (کولکاتا)

قطعات

خموشی میں سلیقہ بولتا تھا
ہزاروں میں وہ تنہا بولتا تھا
غزل اس کی ہر اک سے منفرد تھی
منور کا تو لہجہ بولتا تھا

جسے لوگ کہتے تھے اعلیٰ سخنور
سمو دیتا تھا کوزے میں وہ سمندر
یہ پوچھا کہ ہے کون تو سب یہ بولے
منور منور منور منور

کسی کو گھر ملا حصہ میں یا کوئی دکاں آئی
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا مرے حصے میں ماں آئی

کئی باتیں محبت سب کو بنیادی بتاتی ہے
جو پردادی بتاتی تھی وہی دادی بتاتی ہے

ہمیں حریفوں کی تعداد کیوں بتاتے ہو
ہمارے ساتھ بھی بیٹا جوان رہتا ہے

یاروں کو مسرت میری دولت پہ ہے لیکن
اک ماں ہے جو بس میری خوشی دیکھ کے خوش ہے

☆☆☆

ڈاکٹر صالحہ صدیقی۔(اسسٹنٹ پروفیسر: شعبۂ اردو، سمستی پور کالج، سمستی پور، بہار)

میری محبوب میری ماں: منور رانا

محفلوں و مشاعروں کی شان مقبول و معروف شاعر منور رانا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔منور رانا کا 'اور' ملک کی تقسیم' پر لکھا گیا' مجاہیر نامہ' آج بھی لوگوں کے زبان پر ہے۔منور رانا صاحب کافی دنوں سے بیمار تھے۔وہ لکھنؤ کے پی جی آئی میں زیر علاج تھے۔منور رانا کو گردے اور دل سے متعلق کئی مسائل تھے۔گزشتہ سال اُن کو طبیعت خراب ہونے کے باعث لکھؤ کے اپولو اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔منور رانا کی بیٹی اور ایس پی لیڈر سمیہ رانا نے بتایا کہ ان کے والد کی طبیعت پچھلے دو تین دنوں سے خراب تھی۔ڈائیلاسز کے دوران انہیں پیٹ میں درد ہوا جس کی وجہ سے ڈاکٹر نے انہیں داخل کرایا۔ان کے پتے میں کچھ مسئلہ تھا، جس کی وجہ سے ان کا آپریشن ہوا۔جب ان کی صحت بہتر نہیں ہوئی تو وہ وینٹی لیٹر سپورٹ سسٹم پر چلے گئے اور انتقال کر گئے۔ان کی عمر 71 سال تھی۔سمیہ رانا نے بتایا کہ منور رانا کو ان کی وصیت کے مطابق پیر کو لکھؤ کے عیش باغ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔مشہور نغمہ نگار جاوید اختر نے لکھنو پہنچ کر ان کی تدفین میں شرکت کی۔منور رانا کی تدفین میں شرکت کیلئے لکھنو پہنچے جاوید اختر نے کہا کہ یہ شاعری اور اردو کے لئے بہت بڑا نقصان ہے... مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔یہ نسل ایک ایک کر کے رخصت ہو رہی ہے اور اس کی تلافی کبھی نہیں ہوگی، ان کی کمی کا ہمیشہ احساس ہوگا... ان کی شاعری متاثر کن ہے، ان کا اپنا انداز تحریر تھا۔اچھی شاعری کرنا کافی مشکل ہے لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل ہے اپنی شاعری کرنا"۔ وزیر اعظم نریندر مودی، کانگریس لیڈر راہل گاندھی اور ایس پی کے قومی صدر اکھلیش یادو سمیت کئی دیگر شخصیات نے ان کے انتقال پر غم کا اظہار کیا۔اردو دنیا میں بھی غم کی لہر دوڑ گئی۔وزیر اعظم جناب نریندر مودی نے بھی منور رانا کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کیا۔وزیر اعظم نے X پر پوسٹ کیا:

"جناب منور رانا جی کی رحلت سے دکھ ہوا ہے۔انہوں نے اردو ادب اور شاعری میں بھرپور تعاون دیا ہے۔ان کے اہل خانہ اور مداحوں سے اظہار تعزیت۔ان کی روح کو سکون ملے۔"

منور رانا کی سوانحی کوائف پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ وہ 26 نومبر 1952 کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے، ان کا حقیقی نام سید منور علی ہے۔ان کے والد کا نام سید انور علی اور والدہ کا نام عائشہ خاتون ہے۔منور رانا نے اپنی ابتدائی تعلیم شعیب ودھیالیہ اور گورنمنٹ انٹر کالج، رائے بریلی سے حاصل کی۔اس کے آگے کی تعلیم کے لیے انھیں لکھنؤ بھیج دیا گیا جہاں ان کا داخلہ سینٹ جانس ہائی اسکول میں ہوا۔قیام لکھنؤ انھوں نے وہاں کے روایتی ماحول سے اپنی زبان و بیان کی بنیادیں پختہ کیں۔انہیں سال 2014 میں ان کی ناقابل فراموش خدمات کے لئے ساہتیہ اکادمی سے نوازا گیا۔حالانکہ انھوں نے 2015 میں دادری، نوئیڈا، یوپی کے ہجومی تشدد میں اخلاق کے قتل کے بعد اپنا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ واپس کر دیا تھا۔2012 میں انہیں اردو ادب کی خدمت کے لئے شہید ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ماٹی رتن ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔وہ بیباک، بیخوف اور حق گوئی کی دلدادہ تھے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے کلام میں عوام کے مسائل کو پیش کیا۔

منور رانا کی شاعری میں غزل گوئی نے خاص جگہ لی۔ان کا 'ماں' پر لکھا کلام کافی شہرہ یافتہ ہے۔ان کی غزلیں، ہندی، بنگلہ

(بنگالی) اور گرومکھی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔ منوررانا نے اپنے کلام میں روایتی ہندی اور اودھی زبان کو بخوبی استعمال کیا ہے۔ جس کی وجہ سے انہیں کافی شہرت اور مقام ملا۔ ہر بڑا شاعر اپنے عہد بلکہ آنے والے ہر عہد کو متاثر کرتا ہے۔ اس کا کلام زمانے کی بدلتی ہوئی ہمواریوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔ بدلتے زمانے کی ناہمواریوں پر منور صاحب کی گہری نظر تھی۔ اس لئے اپنی شاعری کا رشتہ معاشرے سے عوام سے جوڑ دیتے تھے۔ یعنی جو کچھ وہ معاشرے میں دیکھتے اس کا بغور مطالعہ کرتے اور اس کا مشاہدہ کرنے کے بعد تجرباتی کیفیت سے ممیّز ہو کر اپنی ہنرمندی سے پراثر الفاظ کا لباس پہنا کر شاعری میں ڈھال دیتے، اُن کے خزانے سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مہاجر ہیں مگر ہم ایک دنیا چھوڑ آئے ہیں
تمہارے پاس جتنا ہے ہم اتنا چھوڑ آئے ہیں

کل اک امرود والے سے یہ کہنا آ گیا ہم کو
جہاں سے آئے ہیں ہم اس کی بغیا چھوڑ آئے ہیں

وہ ایک خوش مزاج، زندہ دل انسان تھے۔ وہ فلم اسٹار شتروگھن سنہا کی آواز کی نقل اس حد تک کرنے لگے تھے کہ حقیقت کا گمان ہونے لگا اور انھیں ''کلکتہ کا شتروگھن سنہا'' بھی کہا جانے لگا۔ وہ ایک خوش مزاج، خوش باش شخصیت کا نام ہے۔ خوش گفتاری اور مہمان نوازی اُن کی شخصیت کے اہم پہلو ہیں۔ زبان کی سلاست کے سبب اُن کی شاعری میں جمالیاتی حسن و نکھار پیدا ہوا۔ سادگی، رعایت لفظی، اسلوبیاتی جدّت نے اُن کی شاعری کو ایک منفرد انداز عطا کیا۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں ہر قسم کے موضوع کو چھیڑا ہے۔ جن میں زندگی کی عصری حسیّت، حالات و واقعات، افکار و خیالات، افعال و اعمال، شادمانی و کامرانی، شکستہ حالی و بدحالی، مسائل و امثال وغیرہ کی بھرپور رہنمائی اور ترجمانی کی گئی ہے۔ انھوں نے بہت ساری وطنی نظمیں بھی لکھی ہیں جو انسان دوستی، بھائی چارگی، رواداری، یگانگت، مساوات، قومی یکجہتی، اخوت، امن و سلامتی، اتحاد و اتفاق، خوشحالی اور یکسوئی کا پیغام دیتی ہے۔ مذہبی و نسلی بھید بھاؤ، تفریق، قتل و غارت گری، انتشار، افتراق، جعل سازی، فتنہ پروری، لوٹ مار، دہشت گردی وغیرہ پیدا کرنے والوں کی شدید لفظوں میں مذمت اور نکتہ چینی کی ہے۔ منوررانا نے اپنی غزلوں کے ذریعہ عشقیہ شاعری کو عروج بخشتے ہوئے ایک ایسی فضا قائم کرنے کی کوشش کی جس میں عاشق و معشوق کی اندرونی کیفیات نکھر کر سامنے آتی ہے۔ ان کے اشعار نہ صرف دل کی گہرائیوں تک پہنچتے ہیں بلکہ درد اور تڑپ سے بھی آشنا کر جاتے ہیں۔ وہ عشقیہ مضامین کو دل نشیں انداز میں باندھنے میں ملکہ رکھتے ہیں۔ آیئے اردو کے اس عظیم شاعر کو یاد کرتے ہوئے ان کی کچھ منتخب اشعار پر نظر ڈالتے ہیں۔

اب جدائی کے سفر کو مرے آسان کرو
تم مجھے خواب میں آ کر نہ پریشان کرو
ایک ہی مسئلہ تا عمر مرا حل نہ ہوا
نیند پوری نہ ہوئی خواب مکمل نہ ہوا

جرأت سے ہر نتیجے کی پروا کیے بغیر
دربار چھوڑ آیا ہوں سجدہ کیے بغیر

ماں ایک ایسی ہستی ہے جس کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہے، ماں جس کے ہونے سے گھر میں جنت ہوتی ہے، بغیر ماں کے پورا گھر ویران سا لگتا ہے۔ منوررانا جنہوں نے غزل کے مفہوم کو بدل کر رکھ دیا، ایک ایسے وقت میں مشاعروں کے منچ سے ماں کے حوالے سے غزل کہنا شروع کیا، جس وقت غزل میں محبوبہ کی تعریف، اس کے لبوں و رخسار پر غزلیں کہی جاتی تھیں۔ اس وقت منوررانا پر لوگوں نے انگلیاں اٹھائی، لوگوں نے سوال کرنا شروع کر دیا کہ آپ یہ کس طرح کی غزل کہہ رہے ہیں؟ جبکہ غزل کے معنی ہی ہوتے ہیں محبوبہ سے باتیں کرنا؟ اس وقت منوررانا نے جواب دیا تھا کہ میں دنیا کے کسی ڈکشنری کو نہیں مانتا، شاعری میں

جومحبوبہ ہوتی ہے وہ دنیا کی سب سے خوبصورت عورت ہوتی ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اگر تلسی داس کے محبوب بھگوان رام ہو سکتے ہیں، ایک کم ظرف شکل وصورت والی لڑکی ہماری محبوبہ ہو سکتی ہے، تو میری محبوب میری ماں کیوں نہیں ہو سکتی۔ ماں کے حوالے سے منور رانا کے کچھ مشہور اشعار ملاحظہ فرمائیں:

میں نے کل شب چاہتوں کی سب کتابیں پھاڑ دی
صرف ایک کاغذ پہ لکھا شبد ماں رہنے دیا

اس طرح میرے گناہوں کو وہ دھو دیتی ہے
ماں بہت غصے میں ہوتی ہے تو رو دیتی ہے

کسی کو گھر ملا حصے میں یا کوئی دکاں آئی
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا مرے حصے میں ماں آئی

چلتی پھرتی ہوئی آنکھوں سے اذاں دیکھی ہے
میں نے جنت تو نہیں دیکھی ہے ماں دیکھی ہے

ابھی زندہ ہے ماں میری مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا
میں گھر سے جب نکلتا ہوں دعا بھی ساتھ چلتی ہے

جب بھی کشتی مری سیلاب میں آ جاتی ہے
ماں دعا کرتی ہوئی خواب میں آ جاتی ہے

منور رانا کی غزلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نازک بیانی کوسادہ طریقہ سے اپنی شاعری میں بیان کرتے ہے ۔اردو کے ساتھ ہندی لفظوں کے استعمال سے ان کی شاعری کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے اور یہ رنگ ان کی تمام شاعری کا خاصہ ہے۔ بہترین لفظوں کو بہترین ترتیب کے ساتھ اپنی شاعری کو ایک مالا میں اس طرح گوندھا ہے کہ قاری بنارکے پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ زبان صاف ستھری اور سہل استعمال کرتے ہے۔ خیال فکر اور پیغام بالکل عیاں ہوتے ہے۔ منور رانا غزل کے فن پر بھی کماحقہ قادر نظر آتے ہیں۔ ان کی زبان سلاست وفصاحت اور نزاکت ونفاست سے آراستہ ہے۔ روایت اور جدّت کے خوشگوار امتزاج کی حامل ان کی غزلیات کو علامات واستعارات اور خوشنما امیجری کے روپ رنگ سے آراستہ سنگھار نے دلہنوں والی خوبصورتی اور دلکشی عطا کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا غزلیہ کلام دل کو چھولیتا ہے۔ ان کی شاعری کا یہ انداز بھی ملاحظہ فرمائیں:

اب جدائی کے سفر کو مرے آسان کرو
تم مجھے خواب میں آ کر نہ پریشان کرو

سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

ایک آنسو بھی حکومت کے لیے خطرہ ہے
تم نے دیکھا نہیں آنکھوں کا سمندر ہونا

فرشتے آ کر ان کے جسم پر خوشبو لگاتے ہیں
وہ بچے ریل کے ڈبوں میں جو جھاڑو لگاتے ہیں

منور رانا کی غزلوں میں تغزل بہت ہے، جتنا نکھرا ہوا رنگِ تغزل ان کے اکثر اشعار میں پایا جاتا ہے ان کے معاصرین میں بہت کم شعراء کو میسر ہے کہ غزل کہنے کا واقعی بالکل نیا ومنفرد لب ولہجہ ہے۔ ایسا لب ولہجہ جس میں رومانیت بھی ہوتی ہے۔ عصری حسیت بھی ہوتی ہے۔ جمالیاتی وژن بھی ہوتا ہے۔ نفسیاتی رویے بھی ہوتے ہیں۔ اقتصادی، معاشرتی، صنعتی اور سماجی عناصر بھی رہتے ہیں۔ نیز وہ موضوعات ومسائل وہ چھوٹی بحروں میں بھی بیان کرتے ہیں اور بڑی بحروں میں بھی اور سب سے خاص بات یہ کہ وہ جہاں لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں، نیز ان محاوروں اور کہاوتوں کو اشعار میں ایسے وصل کر دیتے ہیں جیسے سنگ مرمر میں یاقوت وزمرد کی پچکاری کو شعری سانچے میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ان کی غزل کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ولی محمد زاہدؔ ہریانوی۔ جنرل سکریٹری بزمِ چراغِ ادب، حیدر آباد۔ تلنگانہ

بین الاقوامی شہرت یافتہ ہر دلعزیز شاعر سماجی جہد کار و قومی یکجہتی کے علمبردار

محترم منوّر رانا صاحب کے انتقالِ پُر ملال پر کہی گئی تعزیتی نظم

''غمِ ہجراں''

ماں کا جو احترام مُنوّر نے کیا ہے ☆ روشن جہاں میں نام مُنوّر نے کیا ہے
نفرت کا انہدام مُنوّر نے کیا ہے ☆ اُلفت کو یہاں عام مُنوّر نے کیا ہے
اُردو کی آن بان وہ پہچان گئے ☆ اُردو کے لئے کام مُنوّر نے کیا ہے
شیریں تھا بہت آپ کا اندازِ تخاطب ☆ کیا پُر کشش کلام مُنوّر نے کیا ہے
دیکھا ہے شہہ نشین پہ آتے ہی بارہا ☆ ہنس کر ہمیں سلام مُنور نے کیا ہے
اس عارضی جہان میں خدمت ادب کی کی ☆ جب تک یہاں قیام مُنوّر نے کیا ہے
اس دورِ پُر فتن میں جو کوئی نہ کرسکا ☆ بے شک یہاں وہ کام مُنوّر نے کیا ہے
اس کا صلہ وہ پائیں گے فردوس میں ضرور ☆ جو کام صبح و شام مُنوّر نے کیا ہے
خدمت کرو سماج کی زاہدؔ یہی پیام ☆ جاری ہمارے نام مُنوّر نے کیا ہے

کسی کے زخم پر چاہت سے پٹی کون باندھے گا
اگر بہنیں نہیں ہوں گی تو راکھی کون باندھے گا

بچوں کی فیس ان کی کتابیں قلم دوات
میری غریب آنکھوں میں اسکول چبھ گیا

لپٹ جاتا ہوں ماں سے اور موسی مسکراتی ہے
میں اردو میں غزل کہتا ہوں ہندی مسکراتی ہے

سگی بہنوں کا جو رشتہ ہے اردو اور ہندی میں
کہیں دنیا کی دو زندہ زبانوں میں نہیں ملتا

یقیناً منور رانا اردو شاعری کا سنہرا باب ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ جب تک اردو شاعری زندہ رہے گی منور رانا کا نام بھی سنہرے حروف میں لکھا جاتا رہے گا، وہ بھلے ہی ہم میں نہ ہوں لیکن ان کی تخلیقات ہمیشہ ہماری زبان پر ورد ہوتی رہیں گی اور ان کے قارئین اکثر ان کے اشعار کو گنگناتے رہیں گے۔ میں اپنی باتوں کا اختتام اس شعر پر کرنا چاہوں گی کہ:

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

☆☆☆

ابن نثار۔ لکھنؤ

منظر سے منور تک

غالباً دسمبر 2022 مہینہ کی بات ہوگی کہ میں گھر کے لئے روانہ ہورہا تھا۔ بس میں سوار سرد موسم کی وجہ سے موبائل جیب میں رکھ کر پرسکون بیٹھا تھا۔ یکا یک فون کی گھنٹی بجی جیب سے فون نکالا تو دیکھا ڈاکٹر عمیر منظر بھائی کا فون تھا۔ جلدی سے آٹھایا علیک سلیک کے بعد دریافت کیا کہاں ہو؟؟؟۔

میں نے جلد بازی میں بول دیا گھر جارہاہوں۔ اکیڈمی بند ہے شروع ہوگئی تھی۔ انہوں نے کہا چلو ٹھیک ہے واپس آکر فون کرنا ضروری کا کام ہے۔ فون کٹ گیا۔ کافی دیر تک غور فکر کرتا رہا ،ادھر اُدھر کی باتیں ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ ایک طرف میری خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہی۔ اور دوسری طرف ایک ایسے شخص سے بات کرنا جن کے لئے بڑی شدت سے انتظار کیا کرتا تھا میں اسے کس الفاظ میں بیان کروں سمجھ سے باہر ہے۔ یہ میری زندگی کا وہ لمحہ تھا جس کا میں پچھلے سات سالوں سے انتظار کیا۔ کیونکہ لکھنؤ میں رہ کر ایسے لوگوں سے رابطہ رکھنا میرا اولین شوق تھا۔ لکھنے، پڑھنے کے شوق نے یہ انسیت دائمی طور پر قائم کردی ہے۔ اور جب کوئی اپنے علاقے اور اپنے دیارِ شوق مادر علمی (جامعہ ملیہ اسلامیہ نیو دہلی) کے طالب علم رہے ہوں ان سے ملنے اور باتیں کرنے کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اور لکھنو آنے کے بعد میری ادبی لوگوں میں سب سے پہلی ملاقات عمیر منظر بھائی سے ہوئی۔

اس سے قبل میں جنوبی ہند کی مختلف جامعات میں طالب رہ چکا تھا۔ وہاں کے ادبی رفقاء کی ایک طویل فہرست ہے جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں ہے۔ ہاں مگر ایک بات کا ذکر ضروری ہے یہاں پر جن سے میں لکھنا پڑھنا سیکھا ہے۔ میرے اساتذہ اکرام میں پروفیسر بیگ احساس، پرفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر خالد سعید، پرفیسر نسیم فریس، ڈاکٹر شمش الھدی سر اور مشفق استانیوں میں ڈاکٹر مسرت میم اور ڈاکٹر نور فاطمہ وغیرہ قابل ذکر ہے۔

اسی اڈھیر بن میں گھر تو پہونچ گیا۔ لیکن گھر پہونچنے کے بعد مجھے سکون نہیں ملا۔ شب وروز دماغ میں بس ایک ہی بات چلتی رہی کہ ایسا کیا کام پیش آیا ہے کہ منظر بھائی نے اتنی شدت سے یاد کیا ہے۔ بہرحال دو چار روز کے بعد میں لکھنو واپس ہوا۔ رات کا وقت تھا۔ صبح کے انتظار میں آنکھ سے نیند رخصت ہو چکی تھی۔ اللہ اللہ کر کے صبح ہوئی۔ جلدی سے غسل، اور ناشتے سے فارغ ہوا۔ سیدھا ڈالی گنج مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی شاخ لکھنو کی طرف چل نکلا۔ کافی تفتیش کے بعد مجھے وہ جگہ ملی اور عمیر منظر بھائی کا آفس بھی مل گیا۔

دعا سلام ہوا۔ بعد انہوں نے یسوال کیا: اس وقت کیا کر رہے ہو۔ ناچیز سے رہا نہیں گیا دل کا درد زبان پر یکے بعد دیگرے بیان کرتا چلا گیا۔ کافی گفت وشنید کا بعد انہوں نے کہا: دیکھوں ایسا ہے تم لکھنے والا کام کرتے ہی ہو۔

جب تک تمہارے پاس وقت ہے اس کام کے ساتھ ایک اور کام کرو۔'' میں نے جلدی سے کہا اور کیا کام ہے۔ وہ بولے :ایک جگہ میں لے چلوں گا وہاں بیٹھ کر لکھنا ہے۔ ایک استاد کی خدمت سمجھ کر یہ کام انجام دو۔ انشاء اللہ تمہارے لئے کوئی بہتر سے بہترین راستہ نکلے گا۔ اور ساتھ ہی ساتھ تمہاری لکھنے کی صلاحیت میں چوگونا اضافہ بھی ہوگا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر ہامی بھرلی۔ اور فورا بولا کب چلنا ہے اور کہاں چلنا ہے؟؟؟؟

میری تھوڑی سی بے تکلفی ہر منظر بھائی نے دبے الفاظ میں کہا ذرا صبر سے کام لو۔ اور کہا: تم ایسا کرو کل نہیں تو پرسوں دو بجے کے بعد آنا تب ساتھ میں چلیں گے۔ میں کہا ٹھیک ہے۔ واپس ہونے لگا تو مجھے کچھ کتابیں اور رسالے دیئے۔ اور کہا کہ اس کو پڑھنا اور کچھ لکھنے کی کوشش بھی کرنا جس میں ان کی ایک بالکل نئی ترتیب شدہ کتاب بھی شامل تھی (خان محبوب طرزی، تنقیدی و تجزیاتی مضامین کا مجموعہ)۔ مگر یہ میری بدقسمتی رہی کہ اس آؤ بھگت کے چکر میں اس کتاب پر چند سطور لکھنے سے قاصر رہا۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں بصدق دل۔

دو دن کے بعد میں اس وقت مقررہ پر حاضر ہوا۔ ہم دونوں ساتھ میں موٹر سائیکل پر سوار ہوئے۔ اور سیدھا لکھنو کا وہ عظیم الشان علاقہ جسے حسین آباد کے نام سے موسم کیا جاتا ہے لوگوں سے گھر کا پتہ معلوم کرتے ہوئے پہونچے۔ حالانکہ حسین آباد تو وہاں پر موجودہ امام باڑے کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے۔ لیکن یہ تو لکھنو والوں کی بدنصیبی رہی کی اسی امام باڑے کے عقب میں اردو ادب کا وہ درخشندہ ستارہ جس کو دنیا ادب منور رانا کے سے جانتی تھی مگر پڑوسیوں گلی محلے والے کو اس کی ذرا پراہ نہیں تھی۔ ظاہر ہے بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا والی بات صادق آگئی۔ ہم دونوں بالکل ایک طالب علم کی طرح ان کے دروازے پر پہونچے اور دائیں جانب کھڑے ہوکر دستک دی۔

خادم نے آکر بتایا کہ ابھی سر نہیں ہیں کہیں گئے ہیں۔ اس مژدہ کے بعد ہم ایک طرف ہوکر کچھ باتیں کرتے رہے ابھی ان کے مزاج ہر گفتگو جاری تھی۔ ان کی بزلہ سنجی پر تبسم و نشاط کا سلسلہ جاری رہا، ایک دفعہ گماں ہوا کہ وہ خلاف مزاج کسی کام پر بہت رنج ہوا کرتے ہیں۔ اور خادم کو بھی اس کی تربیت اچھی کر دی تھی۔ دس منٹ تک ہم لوگ انتظار کئے پھر منظر بھائی نے کہا: کہ ان سے بولو کی عمیر منظر آئے ہیں ملنا چاہتے ہیں۔ اب آگے کا احوال ذرا کان دھر سنیئے۔

خادم اندر گیا، مشکل سے ایک منٹ ہوا ہوگا جلد بازی میں واپس دروازہ کھولا اور غصے میں لال۔ چہرہ بالکل سرخ تھا۔ یا یہ لالی پیدائشی تھی سمجھ سے باہر تھی۔ کیونکہ اندر رانا صاحب نے انھیں اچھی دشنام سے نواز چکے تھے۔ ہم دونوں ان کے مہمان خانے میں داخل ہوئے۔ سلام کیا۔

انہوں نے دیکھتے ہی کہا۔ آؤ عمیر آؤ میرے پاس بیٹھو، یار کہاں تھے؟ اتنے دنوں سے۔ منظر بھائی اپنی مصروفیات بتاتے ہوئے کچھ معذرت کر لی۔ اس کے بعد میری طرف نگاہ ڈالی میرے اندر سے سارے اوسان لرزاں تھے۔ یہ میری زندگی کا وہ لمحہ تھا جس کا میں بہت بے صبری سے انتظار کیا۔ آج تک میں اتنا جہاں دیکھے ہوئے آدمی سے روبرو ہونے کا موقع ملے گا یہ سوچا نہیں تھا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے ان کے سامنے بیٹھ کر کچھ دن لکھنے کا موقع عنایت ہوا۔

پوچھنے لگے یہ لڑکا کون ہے۔

''کیا نام ہے بیٹا تمہارا؟؟؟

''جی میرا نام ابراہیم ہے''

''کیا کرتے ہو؟؟؟

''ابھی تو کچھ نہیں۔''

''اردو سے پڑھنا لکھنا جانتے ہو۔''

''جی تھوڑا بہت۔''

اندر تھوڑا استراحت محسوس ہوئی۔ اُس کے بعد میں نے منور رانا صاحب کی پوری شباہت پر نظر دوڑائی۔ عمر رسید کے بعد سر سے فارغ البال نظر آئے یا اس دن انہوں نے بال کی مرمت کروا رکھی تھی، آنکھیں اس قدر بڑی تھیں گویا وہ باہر کو نکلنا چاہتی ہیں، بے ریش چہرہ، لیکن مونچھ کے گھنے بال سفیدی مائل ہو چکی تھی۔ بائیں گال پر آپریشن کی وجہ سے ایک گولی نما ابھار آ گیا تھا، دونوں ہونٹ بہت موٹے ہونٹو کے درمیان جو چاروں دندان مانند تھے وہ بھی شاید پان کھانے کی کثرت سے سیاہ پڑ چکے تھے۔ بولنے

میں انھیں لکنت محسوس ہونے لگی تھی ۔لیکن جب شعر پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی شعر نیند سے جاگ گیا ہے۔آواز میں وہ گھن گرج تھی کہ پڑوس کے لوگ بھی نیند سے بیدار ہو جائیں۔

جسامت کے دھنی انسان تھے۔دیکھا جائے تو ان کا پیٹ اور سینہ ایک جیسا بالکل یکساں معلوم ہو رہا تھا۔لمبی بیماری کی وجہ سے اب پیٹ میں وہ ابھار باقی نہیں رہا۔پیر ہمیشہ ایک کرسی پر سیدھا رکھا کرتے تھے۔کیونکہ ان کے دونوں گھٹنوں کا دو تین مرتبہ آپریشن ہو چکا تھا جس کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک پیڑ لٹکا کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔اور پید کے بارے میں اک مرتبہ کہنے لگے کہ یار میں تو ڈاکٹروں سے بول چکا ہوں کہ میرے گھٹنے میں آپ کولوہے کی چین لگادیں تا کہ بار بار کھولنے میں آسانی ہو سکے ۔جب تک وہ بیٹھے رہتے خادم ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا۔خادم کے بارے میں ایک بیان کرنے لگے کہ یہ ہمارے ساتھ اس قت سے خدمات انجام دے رہا ہے جب اس کی عمر صرف ۱۳ برس تھی۔یہیں لکھنو کے چار باغ اسٹیشن پر ملا تھا ۔اس دن سے آج تک بڑی ایمانداری کے ساتھ حکم بجالاتا ہے ۔اب اس کی عمر صرف ۵۲ سال ہے ۔گھر سارے افراد اسے ہمارے گھر کا حصہ مانتے ہیں۔اس لے لئیکہ پہلے وہ ہمارے گھر کی دیکھ بھال کیا اور اب ہم لوگ اس کے گھر بوجھ اٹھا رہے ہیں۔

زبان کے بہت مہار تھی تھے۔جس موضوع پر بولنا شروع کرتے تھے ختم ہونے کا نام نہیں،درمیان میں کوئی دوسری بات نکل جاتے تب خاموش ہو جاتے۔الفاظ کی ادائیگی اور ذخیرہ کی میں بات کروں بخدا میں اپنی زندگی میں ایسے ایسے الفاظ نہیں سنیں تھے جو ان زبان پر رواں دواں تھے۔شعر سے زیادہ نثر میں ماہر نظر آتے۔کبھی کبھی یہ گمان ہوتا کہ یہ شاعر سے زیادہ نثر نگار ہیں۔ اگر یہ شاعر نہیں ہوتے تو ایک عمدہ اور بہترین نثر نگار ضرور ہوتے ۔دل کی بھی بہت فیاض تھے۔ان کی سخاوت اور فیاضی کا جو نمونہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے شاید پھر کہیں دیکھنے کو ملے ۔کبھی کسی غریب ضرورت مند کو مایوس نہیں لوٹایا۔اس کے علاوہ جو ملاقاتی ان کے پاس آتے تھے،ہمیشہ ان سے جھک کر بات یں دیکھا۔ وہ بات الگ ہے کہ وہ حکومت معاملات میں سخت نظر آئے۔جو بات کرتے بالکل یقین کے ساتھ سینہ ٹھونک کر۔جب بولنا شروع کرتے تو بالکل سکوت طاری ہو جاتا۔بعض دفعہ جب ان کی خاتون خانہ کمرے میں وارد ہوتیں تو ان سے ازراہ مزاق بولتے اب ذرا خاموش رہوں مسجد یہاں داخل ہو چکی ہے۔اس لئے کہ ان کہ زوجہ بہت نیک اور پرہیزگار،دین دار ہیں،ہر وقت ہاتھ میں تسبیح کے دانوں کا لچھہ لئے دیکھا گیا۔اس لئے منور رانا اکثر یہ جملہ ان کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ میرے گھر میں ایک طرف جنت ہے تو دوسری کعبہ ہے اور درمیاں میں بیٹھا یہ شیطان دن رات شاعری کرتا ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ رھی کہ انہوں ذاتی کتب خانہ بنا رکھا تھا۔جب کوئی شاعری کا نیا مجموعہ کلام شائع تو کتب فروش کو فون کر کے پہلے فرصت میں اسے حاصل کرتے ،اور پڑھنے کے بعد اپنی لائبریری کا حصہ بنا دد یتے۔وہ زبان کے بادشاہ تھے،الفاظ کے سمندر تھے،ان کے پاس جملوں کا ایک وسیع وعریض میدان تھا۔اس لئے جب وہ شاعری کرتے تو شاید الفاظ ان کے سامنے صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے کہ اب مجھے بھی استعمال کرلیا جائے۔

اس مختصر سے تعارف میں عمیر بھائی نے کہا: یہ لڑکا لایا ہوں جس کے لئے اپنے کہا تھا کہ کوئی لڑکا ایسا لاؤ جو اچھا لکھنا جانتا ہو۔یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کیا اور کیسا لکھتا ہوں۔کیونکہ آج تک کسی نے کچھ میرے متعلق لکھا نہیں۔کہنے کو تو میں بھی ایک ادنی سا لکھاری ہوں۔لکھتا زیادہ ہوں چھپتا کم ہوں۔شاید یہ چیز عمیر بھائی نے پرکھ لی تھی۔ان کو اس بات کا یقین تھا کہ یہ کام میں منظم انداز میں پایہ تکمیل کر پہونچا دوں گا۔

اس کے بعد ہماری گفتگو شروع ہوئی۔تو بیٹا سنو ایسا ہے کہ میں جو کچھ بولتا جاؤں گا تم صرف لکھتے جانا۔میں نے پانچو حواس

کے ساتھ ان کی ساری بات کی ہامی بھرلی۔ روزانہ دو بجے کے بعد کا وقت مقرر رہوا۔ جس پر میں مدوامت برتی۔ اس کے بعد ہم اور عمیر منظر بھائی دونوں ساتھ میں وہاں سے واپس ہوئے۔ ساتھ میں ہم دونوں اک جگہ رُک کر خرم نگر میں شاداب کالونی کے سامنے ایک ہوٹل پر بہترین چائے نوش کی۔ چائے نوشی کے دوران منظر بھائی منور رانا کے بارے میں بہت ساری خوبیاں بتا دیں اور دبے الفاظ میں یہ بھی بتا دیا کہ اگر کبھی غصے میں اناپ شناپ بولیں تو سن لینا یہ عقلمندی ہے۔

۔۔۔۔۔یہاں پر میں منظر بھائی کا ذکر نہ کروں تو شاید ہمارے لکھنے کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ عمیر منظر کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ان کے جیسا فیاض انسان میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا، ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے، ایک دوست کی حیثیت سے، ایک مشفق استاد کی حیثیت سے، ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے، ایک اچھے ناقد کی حیثیت سے، اور تنقیدی نقطہ نظر کا اگر موازنہ کیا جائے تو میرے نزدیک شمش الرحمٰن فاروقی صاحب کی تصور ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ویسے آج کے اس گرہ بندی کے دور میں کوئی کسی کا سگا نہیں ہے ایسا سنا کرتا تھا مگر اب دیکھا بھی ہے، جانا بھی ہے، ان سب کے باوجود منظر بھائی بالکل منفرد نظر آتے ہیں۔

بات ان کی تنقید کی چل رہی تھی۔ تو میں کہنا چاہوں گا کہ وہ جب بولنا شروع کرتے ہیں تو جو شعور انگیزی شمش الرحمٰن فاروقی کی تحریروں میں ملتی ہے وہ سب منظر کے زبانوں سے نکل رہی ہے۔ سوچنے والی بات یہ ہے جس شخص کے اندر اتنی قادر الکلامی موجود ہو ایسے انسان سے کون دور بھاگ سکتا ہے۔ ہاں ان کی ایک اچھی عادت ہے جو مجھے بہت پسند ہے ان کے اندر انکساری، عاجزی، دیانت داری، دریا دلی کا جو ملکہ موجود ہے کسی اور کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملی۔ باقی لوگ تو صرف ڈاکٹر اور پروفیسر نظر آتے ہیں۔ ایک دوسری بات یہ ہے کہ وہ ہر کسی کی ادبی سطح پر مدد ضرور کرتے ہیں چاہے وہ شخص انجان ہی کیوں نہ ہو۔ بہت باکمال ایسے لوگ ہوتے ہیں اللہ ایسے ذہن کو سلامت رکھے۔ آمین

تو بات چل رہی تھی منور رانا صاحب کی۔ یہ نو جوان شاعروں کے بابا تھے۔ جیسے اردو ادب میں بابائے اردو مولوی عبد الحق تھے بھی اسی طرح شاعری میں یہ بابا کے درجہ کو پہونچتے ہیں۔ ہم اگلے روز ایک قلم اور بیاض لے کر منور صاحب کے گھر حاضر ہوئے۔ سواری کا انتظام نہ ہونے کی صورت میں مجھے عوامی رکشے کا سہارا لینا پڑا۔ اب گرمی ہلکی ہلکی شروع ہو چکی تھی پسینے بھی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس دن شاید گرمی کچھ زیادہ تھی، شرابور حالت میں دروازے پر پہونچا اور دو دستک دی۔

خادم نے دروازہ کھولا اور اندر آنے کو بولا۔ اسے پہلے دن ہی منور صاحب نے تاکید کر دی تھی کہ یہ جب آئیں بلا اجازت اندر بیٹھا دینا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ میری حالت دیکھنے کے بعد انہوں نے کہا: کیا بات ہے بیٹا تم اتنے پسینے میں ڈوبے کیوں ہو؟ چلو پسینے پونچھ لو، شاید میں میرے بے بسی اندازہ ہو گیا تھا۔

"مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا:" آو بیٹا آو میں تمہارے انتظار میں بیٹھا تھا۔ یہ وقت ہوتا ہے میں بالکل سکون سے رہتا ہوں۔ ورنہ ہر وقت کوئی نہ کوئی نہیں ملاقاتی آدھمکتا ہے اور میں ان کے اس تفریح مشاغل کا حصہ ہو جاتا ہوں۔ باتیں اس انداز میں کرتے کہ گویا کبھی کبھی احساس ہوتا کہ یہ ایک شاعر نہیں ایک باپ بھی ہیں۔ حالانکہ میرے والد کا انتقال 2011 میں ہو چکا تھا۔

باتیں چل نکلی رائے بریلی کی، اور یادوں کے سہارے وہ ساری باتیں بولتے رہے اور میں اپنا قلم برق رفتاری کے ساتھ دوڑاتا رہا۔ یہ سلسلہ مسلسل بیس سے پچیس دن تک جاری رہا۔ کبھی کبھی وہ باتوں کے درمیان اس قدر غم گین ہو جاتے کہ آنکھوں سے اشک جاری ہو جاتے تھے۔ بیشتر وقت مجھے رومال اٹھا کر دینا پڑتا تھا۔ دل کی فیاضی اور دلیری کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مشاعروں میں اپنی مرضی سے اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتے تھے

جیسا دیکھا ویسا ہی پایا گیا۔تین شہروں کا چوتھا آدمی۔بچپن بریلی شہر، جوانی کولکاتہ میں، اور بوڑھاپا اودھ کی آغوش میں گذارا۔جس طرح سے وہ شاعری کرتے تھے وہ کسی سے چھپا نہیں ہے۔انہوں نے اردو شاعری میں ایک نئی جہت وتحریک کی ابتداء کی۔وہ عام موضوعات سے ہٹ کر ایک نئی راہ ہموار کی۔

ان کا کہنا تھا کہ: ہم اس راہ پر نہیں چلا کرتے جو عام ہو جائے۔میں اپنا راستہ خود بناتا ہوں۔مجھے میرے خدا پر یقین ہے اس کے سوا میں کسی بھروسہ نہیں کرتا اور نہ کروں گا۔اپنی جوانی کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ: جب میں اپنی زندگی کا پہلا مشاعری پڑھنے گیا تھا اس وقت کلکتہ میں کوئی مجھے جانتا نہیں تھا کہ میں بھی شاعری کرتا ہوں۔کیونکہ ابھی تک مجھے اسٹیج پر پڑھنے کا موقع دستیاب نہیں ہوا تھا۔ہمارے والد صاحب کے دوست جناب والی آسی اکثر وبیشتر ہمارے غریب خانے پر آتے تھے۔ان کی علمی وادبی گفتگو سے مجھے سنور نے موقع عنایت ہوا تھا۔اتفاق سے ان دنوں میں بڑا ٹرک چلایا کرتا تھا ہمارے شہر سے قریب ایک گاؤں مشاعرہ تھا اس میں والی آسی صاحب کو مدعو کیا گیا تھا۔اسی روز مجھے گاڑی لے کر اسی شاہ راہ پر جانا تھا۔میں جانے لگا تو وہ راستے میں مل گئے۔میں گاڑی روک کر کہا:

''کہاں جانا آسی صاحب۔''

''انہوں نے کہا: گاوں میں مشاعرہ ہے۔''

''میں نے کہا آیئے چھوڑ دیتا ہوں۔''

جب ساتھ بیٹھ گئے تو ہم سے کہنے لگے کہ۔منور تم بھی چلو میرے ساتھ اس مشاعرے میں اور میں درخواست کروں گا کہ تم کو پڑھنے کا موقع دیا جائے۔اس مشاعرے کی روداد بتاتے ہوئے منور صاحب کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، جس طرح سے وہ اکثر و بیشتر مشاعرے میں شعر پڑھتے پڑھتے رونے لگتے تھے۔اس دن اتفاق سے گرمی میں کچھ زیادہ اچھال تھا مئی کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔فروری میں سردیا ڈھلان پر آجاتی ہیں۔

باہر کا دروازہ کھلا تھا وہ باہر جھانکتے ہوئے بڑے نم دیدہ ہو کر بولے: میری زندگی کا سب سے پہلا مشاعرہ تھا، تمام بڑے شاعر موجود تھے مشاعرہ شروع ہوا۔سارے شاعر باری باری پڑھتے رہے اور میں اپنی باری کا انتظار کرتا رہا۔مگر مشاعرہ ختم ہو گیا اور میری باری میں تمام سامعین کو گھر کی طرف روانگی کا اعلان ہو گیا۔میں بھی جس جوش میں گیا اسی سے زیادہ دکھ کے ساتھ واپس ہوا۔اور سوچ لیا کہ اب یہاں کبھی کسی مجلس محفل میں شامل نہیں ہونا ہے۔شاعری کرنا ان کا شوق تھا۔پیشہ کے اعتبار وہ ٹرانسپورٹ سے منسلک تھے۔ان تمام زمداریوں کے باوجود اپنی شاعری اور معشوقہ زولیخا کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے۔

ابتدائی شاعری انہوں نے عشق وعاشقی میں ڈوب کر لکھی ہے۔اس لئے کہ یہ دور ہر کسی زندگی میں آتا ہے کوئی اسے روکر گزارتا ہے تو کوئی اسے ہنس کر گزارتا ہے۔بے باکی اور دریا دلی ان کے گھٹی میں بسی تھی۔مشاعروں میں ان کا نام چلنے لگا تو انہوں اپنے پہلے مشاعرے کی ساری کسر نکال لی۔پہلے وہ مشاعرہ پڑھنے کی لالچ میں انتظار کیا کرتے تھے۔اور اس کے بعد وہ دور بھی ان کی زندگی میں آیا کہ مشاعرہ اب ان کی مرضی سے پڑھا جانے لگا۔

مچھلی کھانے کے بہت شوقین تھے۔ان کے مطابق دو سے تین کلو مچھلیاں وہ ایک وقت میں کھالیا کرتے تھے۔یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ایک استاد مانے جانے لگے تھے ہر مشاعرے کے بعد اپنے یار دوستوں کو اپنے پیسے بڑے سے اچھے ہوٹل میں سب کو کھانا کھلاتے تھے۔اس کے بعد اس مشاعرے کی بخیہ ادھیڑنے کے بعد اپنے گھر کو روانہ ہو جاتے تھے۔شاعر وہ ہوتا ہے جو ہر باریک سے باریک شئے پر بہت باریک نگاہ رکھتا ہے۔اور پھر اسی نگاہ کے سفر کو اپنے الفاظ کا لبادہ اڑھا کر عوام کے پیش کر دیتا ہے۔منور رانا نے اپنی ادبی شخصیت خود بنائی ہے اللہ نے انھیں ایسا ادبی شعور عطا کیا تھا جسے پانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔وہی بنگال کا انقلابی ماحول جس میں انھوں نے جانے

کتنے خواب بنے تھے وہ سب آنکھوں سے دیکھا اور ایک جگہ سمیٹ کر رکھ دیا۔

مسجدیں کس نے گرائی، کون مورت لے گیا
ہم اسی الجھن میں اک دن مارکس وادی ہوئے
(منور رانا)

اسی موحول میں منور رانا کی شخصیت سازی ہوئی۔

میں نے پھل دیکھ کر انسانوں کو پہچانا
جو بہت میٹھے ہوں اندر سے سڑے ہوتے ہیں

یہ سب اشعار وہ باتوں باتوں میں اتنی روانی کے ساتھ ادا کرتے تھے کہ کبھی کبھی میں ساری باتیں لکھنے سے قاصر رہ جاتا تھا۔ جب دوبارہ پوچھتا تو مسکراتے ہوئے بولتے، صبح میں بادام کھا کر آیا کرو۔ اگر پیسے نہ ہوں تو مجھ سے لے لو۔

میں ڈر کے مارے پھر کچھ بولتا ہی نہیں۔ کچھ دیر سکوت کے بعد پھری وہی کہانی کا دریا ابھرتا اور اور اپنی روانی کے ساتھ بہتا رہتا تھا۔ اور میں ان تمام قطروں کو اپنی بیاض سمیٹا چلا گیا۔

مجھے بھی لکھنے اور سننے میں بہت خوشی بھی ہوتی تھی اور رشک بھی آتا تھا کہ کاش ہم اور پہلے یہاں آئے ہوتے تو آج ہم کسی لائق انسان نہیں تو کم سے کم ایک چھوٹے سے شاعر ہی بن گئے ہوتے۔ لیکن خدا کو کیا منظور تھا چند دنوں کے بعد پھر ان کو دل دورہ پڑا۔ فالج کا اثر ہوا۔ ساتھ میں شوگر بڑھنے کی وجہ سے دائلاسس چلتی رہیں۔ مارچ کی پندرہ تاریخ کو وہ پھر اسپتال میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد سے مسلسل وہ ہر پندرہ بیس دن پر جایا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ ہمارے درمیان نہیں رہ پائیں گے۔ خدا نے شاید کعبے اور مسجد کے درمیاں بیٹھے شیطان کی ملاقات کا بندوبس کر لیا تھا۔ جب کبھی ان کے بیمار ہونے کی خبر ملتی۔ وہ ساری باتیں میری ذہنوں میں ابھرنے لگتی تھی۔ وہ چہرہ میری نظروں کے سامنے ناچنے لگتا ہے، پھر وہی کیفیت طاری ہو جاتی کہ اب آگے کا قصہ سنو، ااور میں لکھنے کے لئے آمادہ وہ جاتا تھا۔۔ خدا نے شاید ابھی کچھ زندگی باقی رکھی تھی۔ اگست ستمبر تک دو مہینے بالکل ٹھیک سے گزرے ہوں گے کہ اکتوبر مہینے میں پھر سے وہ بیمار ہوئے۔ اور اس طویل بیماری کے بعد اب مالک حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

خدا انھیں غریق رحمت کرے۔ آمین

☆☆☆

مظفر شہ میری

غزل

اپنی شاخوں سے چمٹنے کا ارادہ بھی نہیں
اُڑ کے افلاک کو چھونے کی تمنا بھی نہیں

فتویِ کفر لیے لوگ چلے آتے ہیں
میں نے اُس بت کو ابھی ٹھیک تراشا بھی نہیں

لا کے موجوں نے ہمیں ایسی جگہ پٹکا ہے
بیچ دریا بھی نہیں اور کنارہ بھی نہیں

چاندنی آگئی آنگن میں شکایت لے کر
اُن کے ماتھے سے تو آنچل ابھی سرکا بھی نہیں

آسماں بھر کے نظر آتا ہے جب بھی دیکھوں
وہ حسیں چہرہ جسے آنکھ نے دیکھا بھی نہیں

اُس کے ہاتھوں ہی میں جینا بھی ہے مرنا بھی ہمیں
وہ جو قاتل بھی نہیں اور مسیحا بھی نہیں

کوئی سایہ بھی ہے ہمراہ مظفر کے وہاں
وہ اکیلا ہے مگر اتنا اکیلا بھی نہیں

اسامہ ارشاد معروفی قاسمی۔ پورہ معروف کرتھی جعفر پور مئو یوپی

اردو شاعری کا مینارۂ نور: منور رانا

اردو غزل ہمیشہ سر بلند رہی ہے اور غزل کی یہ سربلندی جہاں اس کی ہیئت، اسلوب اور لہجے کے باعث قائم رہی ہے، وہیں موضوعات کی بوقلمونی نے بھی غزل کو ممیز و ممتاز رکھا ہے، وقتی طور پر ضرور غزل کبھی کبھی نظم کے مقابلے میں کم مقبول رہی ہے؛ مگر غزل کا اجتماعی تأثر ہمیشہ غزل کی مقبولیت کی اساس کو مضبوط کرتا رہا ہے۔ جدید غزل ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی سے ہوتی ہوئی شہریار، بشیر بدر، احمد مشتاق، ساقی فاروقی اور ان کے معاصرین تک پہنچتی ہے تو موضوعات کی سطح پر انقلاب آفریں تبدیلی نے غزل کو مقبولیت کے نئے آسمان عطا کیے۔

جدید غزل گو حضرات کا یہ قافلہ رواں دواں تھا کہ اس میں خوش آئند اضافے کے طور پر منور رانا داخل ہوئے۔ منور رانا نے اپنے مختلف و منفرد لب و لہجے، فنی دسترس، موضوع کے انتخاب، نئی تشبیہات واستعارات اور عام زندگی میں بولے جانے والے الفاظ کا بہترین استعمال کر کے غزل کے منظر نامے پر خود کو منور کیا، بنگال کی خلیج سے اٹھنے والی غزل کی یہ منفرد آواز اردو غزل کے لیے نہ صرف یہ کہ نئی تھی؛ بلکہ معاصرین میں سب سے الگ اور سب سے جدا تھی، منور رانا نے عام فہم باتوں، روزمرہ کے جملوں اور محاوروں کا خوب صورت استعمال کیا ہے، یہی نہیں، بلکہ بعض ٹیڑھی میڑھی اور کھردری آوازوں کو بھی اپنے سلیقے سے کچھ اس طرح غزل میں پرویا ہے کہ ان کو خوب صورت بنا دیا ہے۔ مثلاً مٹھا، رام دانا، بگیا، اوڑھنی، کھدر، سرد تا وغیرہ الفاظ کو استعمال کر کے غزل کے دامن کو مالا مال کیا ہے، یہی نہیں بلکہ منور رانا نے غزل میں خونی رشتوں کو تقدیس عطا کی ہے، جو ان کی پہچان بن گئی ہے۔

منور رانا کا پورا نام سید منور علی ہے، ان کی پیدائش ۲۶ر نومبر ۱۹۵۲ء میں اتر پردیش کے تاریخی شہر رائے بریلی میں ہوئی (وفات 14 جنوری ۲۰۲۴ء)، جہاں ہندی اور اردو کے کئی انمول شاعر اور کوی پیدا ہوئے، ان کے والد سید انور علی رانا اور والدہ عائشہ خاتون ہیں، انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے بیچ بٹوارے کا زخم بھی سہا، تقسیم ہند کے وقت ان کے خاندان اور رشتہ داروں میں سے اکثر لوگ پاکستان ہجرت کر گئے؛ لیکن ان کے والد محترم نے وطن سے اٹوٹ محبت کی وجہ سے ہندوستان کو ہی اپنا مسکن بنایا، عزیزوں کے ہجرت کر جانے کے بعد گھر کے حالات بہت خراب ہو گئے، جس کی وجہ سے ان کے والد نے رائے بریلی کو خیر باد کہا اور کلکتہ منتقل ہو گئے اور ٹرانسپورٹ کا کام شروع کیا، جہاں انھوں نے ۲۵ر برس تک ٹرک چلایا۔

اس طرح منور رانا کا بچپن اور جوانی بڑے حالات، تجربات اور مشاہدات سے گزری ہے، انھوں نے ابتدائی تعلیم ''شعیب وڈیالیہ اور گورنمنٹ انٹر کالج'' رائے بریلی سے حاصل کی اور کلکتہ میں ہائر سکنڈری کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد گریجویشن کی ڈگری کے لیے کلکتہ ہی کے ''امیش چندرا کالج'' سے بی کام کیا۔

منور رانا نے ۲۰ رویں صدی کی ۷ رویں دہائی ۱۹۷۲ء میں شاعری کا آغاز کیا، انھوں نے اپنے پُر جلال اظہار، ریڈیائی آواز، منفرد لب ولہجہ اور فن وعروض کی صحت مند روایات کے احترام والتزام کے ساتھ ساتھ، زندگی کی سفاک حقیقتوں کا مظاہرہ کر کے نہ صرف پورے برصغیر میں مغربی بنگال کی نمائندگی کی؛ بلکہ اردو شاعری کی عالمی بستیوں میں نمایاں مقام بھی حاصل کیا۔ منور رانا حضرت والی آسی لکھنوی کے شاگرد رشید ہیں، آسی لکھنوی اپنے عہد کے معتبر اور استاد شعرا میں شمار کیے جاتے تھے،

جن کا ضرب المثل شعر ہے:

دل ایسی چیز کو ٹھکرادیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہوکر ہم نے آئین وفا بدلا

اہل دل تشریح آداب وفا کرتے رہے
ہم تمہارا نام لے کر تم پہ قرباں ہوگئے

منوّر رانا کی غزل کے تعلق سے ''والی آسی'' ان کے مجموعہ ''نیم کے پھول'' کے فلیپ کور پر لکھتے ہیں:

''منور رانا نے زندگی بسر کرنے کے لیے جس طرز، رویے، سبھاؤ کو اپنایا ہے، تقریباً وہی انداز اور وہی اسلوب انھوں نے بغیر کسی مصلحت کے اپنی غزل کے لیے بھی منتخب کیا ہے۔''

منوّر رانا ایک ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے برسہابرس اپنے اشعار کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ لوگوں کو متاثر کیا ہے؛ بلکہ یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ دراصل رشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ ہماری اردو غزل کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ اردو غزل میں ہماری سماجی اور گھریلو زندگی کے حالات اتنے زیادہ نہیں بیان کیے گئے، جتنے کہ عشق ومحبت کی داستانیں رقم کی گئی ہیں۔ چوکھٹ اور اس کے اندر کی زندگی جہاں ایک عورت ماں بھی ہے، بہن بھی ہے، بیٹی بھی ہے، بیوی بھی ہے، اس کے سارے کردار کی پاکیزگی کو کس طرح شاعری میں لایا جاتا ہے اور گھر سے باہر نکل کر غربت کس طرح فٹ پاتھ پر اپنی زندگی گزارتی ہے، اس غربت کا نقشہ، چوکھٹ کے اندر کی ماں بہنوں کی زندگی کا نقشہ، اس کو غزل میں آزادی کے بعد پہلی بار جس شخص نے بڑے معتبر لہجے میں پیش کیا ہے وہ منوّر رانا ہیں۔

منوّر رانا نے غزل کی ان لفظیات کو جو ہمیں ادبا سے ملیں یا وہ موضوعات جو پرانے لوگوں نے ہمیں عنایت کیے ہیں، ان کو اس خوب صورتی سے اور فن کاری سے بدلا ہے کہ ان کی فکر کی چھوٹ سے ان کے فن کا پیمانہ بھی جگمگانے لگا ہے، وہ نئے موضوعات جنھیں غزل میں لوگوں نے نہیں سمویا تھا، وہ سب منوّر رانا کی شاعری میں ابھر کر سامنے آتے ہیں، انھوں نے اپنی شاعری میں ایسے گرے پڑے موضوعات کو جگہ دی، جنھیں اردو غزل والے اچھوت سمجھتے تھے۔ مثلاً غزل میں ٹرین میں جھاڑو لگاتے ہوئے بچوں کا ذکر کرنا، بیڑی بنانے والی عورتوں کا تذکرہ، اسٹیشن پر بوجھ ڈھونے والے قلی کا ذکر، فٹ پاتھ پر لیٹے ہوئے مسافروں کا ذکر وغیرہ، اس طرح کے بہت سارے موضوعات اور الفاظ ہیں جن کو انھوں نے محترم بنادیا ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بلک رہے ہیں زمینوں پہ بھوک سے بچے
مرے بزرگوں کی دولت کھنڈر کے نیچے ہے

بس اسی احساس کی شدت نے بوڑھا کردیا
ٹوٹے پھوٹے گھر میں اک لڑکی سیانی اور ہے

ریت پر کھیلتے بچوں کو ابھی کیا معلوم
کوئی سیلاب گھروندا نہیں رہنے دیتا

سوجاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اخبار بچھاکر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

ہم نہ دلی تھے نہ مزدور کی بیٹی لیکن
قافلے جو بھی ادھر آئے ہمیں لوٹ گئے

دھواں بادل نہیں ہوتا کہ بچپن دوڑ پڑتا ہے
خوشی سے کون بچہ کارخانے تک پہنچتا ہے

مسجد کی چٹائی پہ یہ سوئے ہوئے بچے
ان بچوں کو دیکھو، کبھی ریشم نہیں دیکھا

فرشتے آ کے ان کے جسم پر خوشبو لگاتے ہیں
وہ بچے ریل کے ڈبے میں جو جھاڑو لگاتے ہیں

پیٹ کی خاطر فٹ پاتھوں پر بیچ رہا ہوں تصویریں
میں کیا جانوں روزہ ہے یا روزہ میرا ٹوٹ گیا

امیری ریشم وکمخواب میں ننگی نظر آئی
غریبی شان سے اک ٹاٹ کے پردے میں رہتی ہے

بوجھ اٹھانا شوق کہاں ہے؟ مجبوری کا سودا ہے
رہتے رہتے اسٹیشن پر لوگ قلی ہوجاتے ہیں

رکھتے ہیں ہم کو چاہنے والے سنبھال کے
ہم ننھے روزہ دار کی مسواک ہوگئے

میں ہوں مٹی تو مجھے کوزہ گروں تک پہنچا
میں کھلونا ہوں تو بچو ں کے حوالے کردے

آنسو نمک ملا ہوا پانی ہی تھے مگر
آنکھوں میں رہتے رہتے خطرناک ہوگئے

نہ میں کنگھی بناتا ہوں، نہ میں چوٹی بناتا ہوں
غزل میں آپ بیتی کو میں جگ بیتی بناتا ہوں
غزل وہ صنف نازک ہے جسے اپنی رفاقت سے
وہ محبوبہ بنالیتا ہے، میں بیٹی بناتا ہوں
مجھے اس شہر کی سب لڑکیاں آداب کرتی ہیں
میں بچوں کی کلائی کے لیے راکھی بناتا ہوں

منوررانا گاؤں کی مٹی سے بے حد مانوس نظر آتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کے قول وعمل میں نہ تو تضاد ہوتا ہے، نہ ریا کاری اور نہ اداکاری ہوتی ہے، اس مادّی دنیا میں اگر شرم وحیا، غیرت وحمیت، محبت و شرافت اور مروّت باقی ہے تو وہ گاؤں میں ہے، گاؤں میں بسنے والے اپنی دیوار حیات پر رنگ وروغن چڑھا کر نمائش اور بناوٹ کے اصول پر کاربند نہیں رہتے؛ بلکہ سچائی، سادگی، خلوص اور وفا پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ منوررانا نے اپنے اشعار میں گاؤں کو ان ہی صفات کے لیے برتا ہے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے اشعار:

تمھیں سچی محبت کے کئی قصے سنائے گا
ہمارے گاؤں آنا تم، وہاں اک پان والا ہے

ابھی موجود ہے اس گاؤں کی مٹی میں خودداری
ابھی بیوہ کی غیرت سے مہاجن ہار جاتا ہے

ابھی لہجے میں تھوڑی سی اَنا کی دھوپ باقی ہے
ابھی تک ایک کمرہ گاؤں میں دالان والا ہے

تمہارے شہر میں میت کو سب کاندھا نہیں دیتے
ہمارے گاؤں میں چھپر بھی سب مل کر اٹھاتے ہیں

گاؤں کے بھولے بھالے باسی، آج تلک یہ کہتے ہیں
ہم تو نہ لیں گے جان کسی کی، رام دکھی ہوجاتے ہیں

وہ ایک شخص جو بچپن سے میرے گاؤں میں ہے
یہ جانتا نہیں کوئی کہ دیوتاؤں میں ہے

تمہارے شہر کی یہ رونقیں اچھی نہیں لگتیں
ہمیں جب گاؤں کے کچے گھروں کی یاد آتی ہے

ہم گاؤں میں جب تک رہتے تھے، یہ سب منظر مل جاتے تھے
دو چار کنویں مل جاتے تھے، دس بیس شجر مل جاتے تھے

خوددار انسان ہمیشہ صبر سے کام لیتا ہے، کبھی کوئی ضرورت

یا حاجت اسے مجبور کرتی بھی ہے تو وہ کسی سے اپنی بات نہیں کہہ پاتا، زبان پر تالے پڑ جاتے ہیں اور صبر ہی اس کا ساتھی ہوتا ہے۔ منور رانا نے خوددار انسان کے جذبات کی بہترین عکاسی کی ہے، دراصل یہ ان کے اندر کا خوددار انسان ہے، جو ان کی شاعری میں بھی در آیا ہے۔

جہاں تک اَنا کا تعلق ہے، تو یہ انسان کو خوددار بناتی ہی ہے، ساتھ ہی اپنی شرطوں پر کام کرنے کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہے، اَنا انسان کا زیور ہے، جس شخص کے پاس اَنا نہیں ہوتی، وہ ذلیل وخوار ہوتا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اَنا جب حدیں پار کرتی ہے تو غرور اور گھمنڈ سے ہوتی ہوئی تکبر میں بدل جاتی ہے اور تکبر انسان کو زیب نہیں دیتا۔ یہ تو صرف اور صرف اللہ کا وصف ہے؛ اس لیے جب انسان تکبر کرتا ہے تو اسے ذلت وخواری کا سامنا ہوتا ہے۔ منور رانا نے اَنا کو بخوبی نبھایا ہے:ـ

اگر آداب کر لیتے تو مسند مل گئی ہوتی
اگر لہجہ بدل لیتے گورنر ہو گئے ہوتے

خوش رہتا ہے وہ اپنی غریبی میں ہمیشہ
راناؔ کبھی شاہوں کی غلامی نہیں کرتا

عمر بھر اس نے بھی مجھ سے میرا دکھ پوچھا نہیں
میں نے بھی خواہش کو اپنی بے زباں رہنے دیا

اَنا نے میرے بچوں کی ہنسی بھی چھین لی مجھ سے
یہاں جانے نہیں دیتی، وہاں جانے نہیں دیتی

ضرورت سے اَنا کا بھاری پتھر ٹوٹ جاتا ہے
مگر پھر آدمی بھی اندر اندر ٹوٹ جاتا ہے

جہاں تک ہو سکا ہم نے تمہیں پردہ کرایا ہے
مگر آے آنسوؤ! تم نے بہت رسوا کرایا ہے

چمک ایسے نہیں آتی ہے خودداری کے چہرے پر
اَنا کو ہم نے دو دو وقت کا فاقہ کرایا ہے

وہ سربلند ہمیشہ خوشامدوں میں رہا
میں سر جھکائے رہا اور سرمدوں میں رہا

مادرِ وطن سے منور رانا کی محبت اور وفاداری کا جذبہ بھی نمایاں ہے، وہ ملک میں روبہ انحطاط اخلاقی گراوٹ سے دل برداشتہ ہوتے ہیں اور ہماری تہذیب وثقافت اور تمدن کی بقا کی کوشش میں اپنے اشعار کو زبان کا لبادہ عطا کرتے ہیں اور اپنے خاص لب ولہجے میں یوں گویا ہوتے ہیں:ـ

ضرورت روز ہجرت کے لیے آواز دیتی ہے
محبت چھوڑ کر ہندوستاں، جانے نہیں دیتی

مرا خمیر بنا ہے وہاں کی مٹی سے
جہاں کی فاحشہ بھی بے وفا نہیں ہوتی

گلے ملتے ہیں موسم سے جہاں موسم دکھائیں گے
اللہ آباد آنا ہم تمھیں سنگم دکھائیں گے

سر پھرے لوگ ہمیں دشمنِ جاں کہتے ہیں
ہم جو اس ملک کی مٹی کو بھی ماں کہتے ہیں

تجھ کو اے خاکِ وطن! میرے تیمّم کی قسم
تو بتادے کہ یہ سجدوں کے نشاں کیسے ہیں؟

مدینے تک میں ہم نے ملک کی خاطر دعا مانگی
کسی سے پوچھ لے، اس کو وطن کا درد کہتے ہیں

اس امر سے ہر حساس اور باشعور شخص بخوبی واقف ہے کہ موجودہ عہد میں سیاست نے نہ صرف ہماری سماجی اور معاشی

زندگی تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے؛ بلکہ سیاست دانوں نے ملک کی روایتی قومی ہم آہنگی، امن وآشتی اور انسان دوستی کو اپنی سیاسی بساط پر مہرے کی طرح استعمال کیا ہے؛ تاکہ ان کی سیاسی دکانیں چمک سکیں۔ منور رانا کو بھی ہر لمحہ اس کا احساس ہے اور یہ احساس جب شدت اختیار کر لیتا ہے تو شاعر اسے صفحۂ قرطاس پر یوں بکھیرتا ہے:

محبت کرنے والوں میں یہ جھگڑا ڈال دیتی ہے
سیاست، دوستی کی جڑ میں مٹھا ڈال دیتی ہے
طوائف کی طرح اپنے غلط کاموں کے چہرے پر
حکومت، مندر اور مسجد کا پردہ ڈال دیتی ہے

یہ دیکھ کر پتنگیں بھی حیران ہوگئیں
اب تو چھتیں بھی ہندو مسلمان ہوگئیں

سیاست نفرتوں کا زخم بھرنے ہی نہیں دیتی
جہاں بھرنے پہ آتا ہے تو مکھی بیٹھ جاتی ہے

دنیا مرے کردار پہ شک کرنے لگے گی
اس خوف سے میں نے کبھی کھدر نہیں پہنا

ہم کہ شاعر ہیں، سیاست نہیں آتی ہم کو
ہم سے منہ دیکھ کے لہجہ نہیں بدلا جاتا

منور رانا نے غریبی اور مفلسی کی بڑی دھوپ سہی ہے، غربت اور اس کے نیچے رہنے والے انسانوں کی زندگیوں کو بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں غریبوں اور مزدوروں کے ناگفتہ بہ حالات اور ان پر ہونے والے ظلم وستم اور استحصال کے خلاف برہمی اور احتجاج کی لو شدت اختیار کر گئی ہے؛ مگر اس میں نعرے بازی نہیں، بلکہ حقیقی زندگی کی برہنہ عکاسی ہے، جو انھیں ترقی پسند اور حقیقت نگار شاعروں میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے: ؎

مفلسی نے سارے آنگن میں اندھیرا کر دیا
بھائی خالی ہاتھ لوٹے اور بہنیں بجھ گئیں

شرم آتی ہے مزدوری بتاتے ہوئے ہم کو
اتنے میں تو بچوں کا غبارہ نہیں ملتا

بھٹکتی ہے ہوس دن رات سونے کی دکانوں میں
غریبی کان چھدواتی ہے تنکا ڈال دیتی ہے

ہم نے بازار میں دیکھے ہیں گھریلو چہرے
مفلسی تجھ سے بڑے لوگ بھی دب جاتے ہیں

کہنے کو ایک آنسو تھا بچے کی آنکھ میں
لیکن تمام رونقِ بازار لے گیا

اپنے گھر میں سر جھکائے اس لیے آیا ہوں میں
اتنی مزدوری تو بچے کی دوا کھا جائے گی

معلوم نہیں کیسی ضرورت نکل آئی
سر کھولے ہوئے گھر سے شرافت نکل آئی

زندگی میں آج اک سچی عبادت میں نے کی
یعنی اک روتے ہوئے بچے کا بوسہ لے لیا

غم سے فرصت ہی کہاں ہے کہ تجھے یاد کروں
اتنی لاشیں ہوں تو کاندھا نہیں بدلا جاتا

انسانی زندگی بڑی بھاگ دوڑ، افراتفری اور تصادم میں گزرتی ہے، انسان تمام عمر لڑنے جھگڑنے، سلجھنے اور سلجھانے میں گزار دیتا ہے؛ لیکن زندگی جوں ہی تمام ہوتی ہے، کیا ہوتا ہے؟ اس کو منور رانا بتانے کی کوشش کر رہے ہیں اور نصیحت بھی: ؎

تھکن کو اوڑھ کے بستر میں جا کے لیٹ گئے
ہم اپنی قبر مکرر میں جا کے لیٹ گئے
تمام عمر ہم اک دوسرے سے لڑتے رہے
مگر مَرے تو برابر میں جا کے لیٹ گئے

منوّر رانا کی شاعری میں غزل گوئی ہی نے جگہ لی، ان کی غزلوں میں شوخی کم، حقیقت پسندی زیادہ پائی جاتی ہے، انھوں نے اپنے کلام میں روایتی ہندی اور اَودھی زبان کا بخوبی استعمال کیا ہے، جس کی وجہ سے انھیں نہ یہ کہ صرف اردو شاعری میں، بلکہ ہندی شاعری میں بھی کافی شہرت ملی۔

منوّر رانا کی شاعری میں ''ماں'' کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، انھوں نے معشوقہ کی جگہ غزل میں ماں کو لاکر رشتوں کی پاکیزگی کو جس خوب صورتی سے شاعری میں ڈھالا ہے، وہ قابل قدر ہے۔''ماں کے قدموں تلے جنت ہے'' اس پس منظر میں انھوں نے ماں کی عظمت اور اس کے تقدس کو اجاگر کرتے ہوئے اتنی کثرت سے اشعار کہے ہیں کہ ان اشعار کا مجموعہ ہی ''ماں'' کے نام سے اردو، ہندی اور بنگلہ میں شائع ہوکر بے حد مقبول ہوا۔غزل میں معشوقہ کی جگہ ماں کو لانے اور اس پر شاعری کرنے کی تحریک ان کو کیسے اور کہاں سے ملی، وہ خود فرماتے ہیں:

''جب میں کلکتہ میں پڑھتا تھا تو اکثر ہمارے جو بنگالی دوست تھے، وہ کہتے تھے کہ جب ہمارا ''بنگلہ ساہتیہ'' انگریزوں سے پنجہ لڑا رہا تھا تو تب تمہاری اردو غزل کوٹھے سے اتر رہی تھی۔ظاہر سی بات ہے، مجھے برا تو لگتا، لیکن میں سوچتا کہ بات تو صحیح ہے، ہماری اردو غزل میں آنکھ، کان، ناک، گردن، سینہ، کمر، بازو یہ سب بہت ہوگیا۔''دوپٹہ آگے سے دوہرا نہ اوڑھو، نمودار چیزیں چھپانے سے کیا حاصل وغیرہ وغیرہ'' غزل بالکل کچے گوشت کی دکان ہوگئی تھی، میں نے کہا: نہیں، میری محبوبہ میری ماں ہونی چاہیے،اس کے ذریعہ ماں کے مقدس رشتے کی حقیقت بیان کرنی چاہیے۔اور جب میں ماں پر شعر کہنے لگا تو تنقید نگار مجھ پر تنقید کرنے لگے کہ نہیں صاحب! غزل کے معنی محبوب ہی سے باتیں کرنے کے ہیں، تو میں نے کہا کہ جب ایک معمولی شکل وصورت والی عورت میری محبوبہ بن سکتی ہے تو میری ماں میری محبوب کیوں نہیں ہوسکتی! جب تلسی داس کے محبوب ''بھگوان رام'' ہوسکتے ہیں تو میری ماں میری محبوب بالکل ہوسکتی ہے اور پھر میں ''ماں'' پر شعر کہنے لگا۔'' (ٹی وی پر دیے گئے انٹرویو سے اقتباس)

منوّر رانا کی ماں کے کردار پر کی جانے والی شاعری، جسے پوری اردو دنیا میں عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، جسے لوگ بڑی محبت سے سنتے ہیں،اس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:۔

میں نے کل شب چاہتوں کی سب کتابیں پھاڑ دیں
صرف اک کاغذ پہ لکھا لفظ ماں، رہنے دیا

کسی کو گھر ملا حصے میں، یا کوئی دکاں آئی
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا، مرے حصے میں ماں آئی

اس طرح میرے گناہوں کو وہ دھو دیتی ہے
ماں بہت غصے میں ہوتی ہے تو رو دیتی ہے

یوں تو اب اس کو سجھائی نہیں دیتا لیکن
ماں ابھی تک مرے چہرے کو پڑھا کرتی ہے

میری خواہش ہے کہ میں پھر سے فرشتہ ہوجاؤں
ماں سے اس طرح لپٹ جاؤں کہ بچہ ہوجاؤں

دعائیں ماں کی پہنچانے کو میلوں میل جاتی ہیں
کہ جب پردیس جانے کے لیے بیٹا نکلتا ہے

کچھ نہیں ہوگا تو آنچل میں چھپالے گی مجھے
ماں کبھی سر پہ کھلی چھت نہیں رہنے دے گی

تیرے دامن میں ستارے ہوں تو ہوں گے اے فلک!
مجھ کو میری ماں کی میلی اوڑھنی اچھی لگی

بلندیوں کا بڑے سے بڑا نشان چھوا
اٹھایا گود میں ماں نے تب آسمان چھوا

اے اندھیرے! دیکھ لے منہ تیرا کالا ہوگیا
ماں نے آنکھیں کھول دیں، گھر میں اجالا ہوگیا

منوّر ماں کے آگے یوں کبھی کھل کر نہیں رونا
جہاں بنیاد ہو اتنی نمی اچھی نہیں ہوتی

ہر سہولت تھی میسر؛ لیکن اس کے باوجود
ماں کے ہاتھوں کی پکائی روٹیاں اچھی لگیں

منوّر رانا کے اس انفرادی رنگ کو بھی دیکھیے، جس میں فکر کی ندرت ہے اور اظہار کی طرفگی بھی، احساس کی شدت بھی ہے اور جذبات کی حدت بھی، ان میں تغزل کا جدید رنگ بھی ہے اور لہجے کا بانکپن بھی، تجربات کا تنوع بھی ہے اور مشاہدات کی گہرائی وگیرائی بھی: ؎

تعلق کی سبھی شمعیں بجھادیں اس لیے میں نے
تمھیں مجھ سے بچھڑ جانے میں دشواری نہیں ہوگی

بے سبب آنکھوں میں آنسو نہیں آیا کرتے
آپ سے ہوگا یقیناً مرا رشتہ کوئی

اتنا سانسوں کی رفاقت پہ بھروسہ نہ کرو
سب کے سب مٹی کے انبار میں کھو جاتے ہیں

ہم سایہ دار پیڑ زمانے کے کام آئے
جب سوکھنے لگے تو جلانے کے کام آئے
تلوار کی نیام کبھی پھینکنا نہیں
ممکن ہے دشمنوں کو ڈرانے کے کام آئے
کچا سمجھ کے بیچ نہ دینا مکان کو
شاید کبھی یہ سر کو چھپانے کے کام آئے

مہاجرو! یہی تاریخ ہے مکانوں کی
بنانے والا ہمیشہ برآمدوں میں رہا

بلندی دیر تک کس شخص کے حصے میں رہتی ہے
بہت اونچی عمارت ہر گھڑی خطرے میں رہتی ہے

''مہاجر نامہ'' کے چند اشعار دیکھیے: ؎

مہاجر ہیں مگر ہم ایک دنیا چھوڑ آئے ہیں
تمہارے پاس جتنا ہے ہم اتنا چھوڑ آئے ہیں
کئی آنکھیں ابھی تک یہ شکایت کرتی رہتی ہیں
کہ ہم بہتے ہوئے کاجل کا دریا چھوڑ آئے ہیں
ہمالہ سے نکلتی ہر ندی آواز دیتی ہے
''میاں! آؤ وضو کرلو'' یہ جملہ چھوڑ آئے ہیں
وضو کرنے کو جب بھی بیٹھتے ہیں یاد آتا ہے
کہ ہم عجلت میں جمنا کا کنارا چھوڑ آئے ہیں
تو ہم سے چاند! اتنی بے رخی سے بات کرتا ہے
ہم اپنی جھیل میں اک چاند اترا چھوڑ آئے ہیں
وہ جو پتلی سڑک اُناؤ سے موہان جاتی ہے
وہیں حسرت کے خوابوں کو بھٹکتا چھوڑ آئے ہیں

یادِ مسرور کی تقریب میں مشہور و معروف ادیب و صحافی ڈاکٹر مختار احمد فردین صدر آل انڈیا اُردو ماس سوسائٹی فار پیس کو علماء، ادباء و شعراء دبستان مسرور کی طرف سے اعزاز وایوارڈ سے نوازتے ہوئے۔

یہاں آتے ہوئے ہر قیمتی سامان لے آئے
مگر اقبالؔ کا لکھا ترانا چھوڑ آئے ہیں
ہماری اہلیہ تو آگئیں ماں چھٹ گئی آخر
کہ ہم پیتل اٹھالائے ہیں، سونا چھوڑ آئے ہیں

منوّر رانا ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نثر نگار اور بہترین انشاپرداز بھی تھے، جتنی خوب صورتی سے وہ شاعری کرتے تھے، اتنی ہی فن کاری سے نثر نگاری بھی کرتے تھے، ان کی شاعری سننے اور پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی نثر بھی پڑھنی چاہیے، فیصلہ نہیں کر پائیں گے کہ وہ شاعری اچھی کرتے تھے یا نثر نگاری۔

اخبارات ورسائل میں ان کے تحقیقی مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں، اس کے علاوہ اردو ادب کے اس طویل سفر میں منوّر رانا نے اردو دنیا کو بہت کچھ دیا۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی کے چیئرمین بھی بنائے گئے، اخبارات کی ادارت بھی کی، فلموں میں کہانیاں اور ڈرامے بھی لکھے، اب تک نثر و نظم میں ان کی کئی کتابیں اردو، ہندی، دیوناگری اور بنگلہ زبان میں شائع ہوکر بے حد مقبول ہوئیں۔

جن میں ''ماں''، ''مہاجر نامہ''، ''شہدابہ''، ''غزل گاؤں''، ''گھر اکیلا ہوگیا''، ''ڈھلان سے اترتے ہوئے''، ''بغیر نقشے کا مکان''، ''کہو ظلِ الٰہی سے''، ''نیم کے پھول''، ''سفید جنگلی کبوتر''، ''پھنک تال''، ''سخن سرائے''، ''جنگلی پھول''، ''چہرے یاد رہتے ہیں''، ''سب اس کے لیے'' وغیرہ شامل ہیں۔ اس مدت میں منوّر رانا کو بہت سارے ایوارڈ اور اعزازات سے بھی نوازا گیا، جن میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، امیر خسروؔ ایوارڈ، میر تقی میرؔ ایوارڈ، غالبؔ ایوارڈ، ڈاکٹر ذاکر حسین ایوارڈ، سرسوتی سمان ایوارڈ، مولانا عبدالرزّاق ملیح آبادی ایوارڈ، استاد بسم اللہ خاں ایوارڈ، کبیرؔ ایوارڈ، مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی اور ہمایوں کبیر ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔ آج کے اس خود غرض دور میں منوّر رانا جیسے قلندر صفت انسان شاعر کا وجود بڑا ہی غنیمت تھا۔

☆☆☆

رفیعہ نوشین(حیدرآباد دکن)

منور رانا کے شعر و ادب میں تصور موت و حیات

زندگی، انسان کی زندگی کا پہلا مرحلہ ہے جو وجود انسانی کی صورت میں ہے اور موت اس پہلے مرحلے کے اختتام کا نام ہے۔ یہی موت زندگی کے ایک نئے مرحلے کا آغاز ہے اور وہ آخرت ہے۔ منور رانا جو مخصوص لب ولہجہ، مخصوص لفظیات، منفرد سوچ اور مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ ماں پر ان کے اشعار ان کی شخصیت کی شناخت بن گئے تھے۔

بقول معین شاداب ''منور رانا نے ماں کے پاکیزہ موضوع کو اس قدر برتا، گویا انہوں نے اسے اپنے حق میں 'پیٹنٹ' کرا لیا''۔ اسی لئے ماں کے موضوع پر ان کی شاعری جاودانی ہو گئی لیکن وہ صرف ''ماں'' پر شاعری کرنے والے شاعر نہیں تھے بلکہ فن غزل میں انہوں نے متنوع موضوعات یا تصور کو سلاست کے ساتھ بہترین پیرائے میں برتا ہے۔ جس میں موت و حیات کا تصور بھی شامل ہے۔

زندگی، بلاشبہ، ایک شاندار چیز ہے جس میں ہر گھنٹے، ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سیکھنے کی گنجائش رہتی ہے۔ زندگی ہمارے لیے ایک درس گاہ ہے جس میں ہر قسم کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی صلاحیت، ذہانت اور وسعت نظر کے مطابق موت و حیات کے بارے میں اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ زندگی کو غم اور خوشی کا ڈرامہ بھی کہا جاتا ہے۔ تبھی تو ولیم شیکسپیئر نے کہا تھا کہ: ''تمام دنیا ایک اسٹیج ہے، اور تمام مرد اور خواتین محض کھلاڑی ہیں۔ اور اپنے وقت میں ایک آدمی بہت سے کردار ادا کرتا ہے۔''

جب کہ منور رانا دنیا کو سرکس اور تماشہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ''ہم سب سرکس کے اس جوکر کا رول ادا کر رہے ہیں جو ہنسانے کے لئے روتا ہے اور رلانے کے لئے کھلکھلا کر ہنس دیتا ہے۔''

منور رانا کو شاید اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ ان کی زندگی قریب الختم ہے۔ جس کا اظہار ان کے اس شعر میں ملتا ہے کہ:

''بہت دن رہ گئے دنیا کی سرکس میں تم اے رانا
چلو اب اٹھ بھی جاؤ تماشہ ختم ہوتا ہے''

منور رانا کی زندگی کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ وہ شاعری کے علاوہ نثر نگاری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور نثر لکھنے پر انہیں ڈاکٹر مظفر حنفی، سید منیر نیازی اور احسن مفتاحی جیسے علمی و ادبی شخصیات نے راغب کیا تھا۔ ان کی نثر نگاری بہت ہی شگفتہ اور دل پذیر ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق انشاء پرداز اور خاکہ نگار تھے۔ افسوس کہ نثر میں انہیں وہ مقام نہ مل سکا جو کہ ملنا چاہئے تھا۔ ان کا ایک مضمون جس کا عنوان ہے ''سر بہ سجدہ ہے مسیحا کہ مری بات رہے'' میں انہوں نے زندگی اور موت کے تصور کو یوں بیان کیا ہے کہ: ''زندگی آنکھوں میں خوابوں کی سنہری فصل اگائے تعبیروں کی بارش کی منتظر رہتی ہے اور ایک نہ ایک دن تھک جاتی ہے۔ تھکن' موت کی پہلی دستک کا نام ہے'' اور اس دستک کو جس وقت انہوں نے محسوس کیا تو کہنے لگے:

میری مٹھی سے یہ بالو سرک جانے کو کہتی ہے
کہ اب یہ زندگی مجھ سے بھی تھک جانے کو کہتی ہے
جسے ہم اوڑھ کر نکلے تھے آغاز جوانی میں
وہ چادر زندگی کی اب مسک جانے کو کہتی ہے!

اور اسی تھکن سے چور ہو کر قبر میں جانے سے پہلے ہی انہوں نے کہا تھا کہ

'' تھکن کو اوڑھ کے بستر میں جا کے لیٹ گئے

ہم اپنی قبر مقرر میں جا کے لیٹ گئے '' !

انسان کی زندگی میں کئی مرتبہ ایسا وقت آتا ہے جب وہ خود کو موت کے بہت قریب محسوس کرتا ہے۔اسے لگتا ہے کہ بس اب وہ کسی بھی لحظہ اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔منور رانا کا ایک قول ہے کہ: ''موت، بیماری اور ڈاکٹر سے نجات ناممکن ہے''۔جو کہ صد فیصد سچ ہے۔

ان کی زندگی میں بھی ایسے کئی مواقع آئے جب انہوں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کی دستک بھی محسوس کی تھی ۔کیونکہ وہ عرصہ دراز سے کینسر، گردے اور دل کے امراض میں مبتلا تھے اور طویل عرصے سے وینٹی لیٹر پر تھے۔ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کی طبیعت خراب ہوگئی تھی، انہیں ہسپتال میں شریک کیا گیا اور علاج کے لئے ICCU میں لے جایا جارہا تھا تو انہیں لگا تھا کہ ان کا آخری وقت آچکا ہے۔زندگی جس قدر انسان کے لئے پر کشش ہوتی ہے، اسی قدر اس کے خاتمے کا تصور آدمی کے لئے تکلیف دہ اور ڈرانے والا ہوتا ہے۔انہوں نے اس وقت کی قلبی واردات، جذبات واحساسات کو کس طرح قلم بند کیا ہے ملاحظہ کریں:

''میرے جسم کو لاد پھاند کر ICCU کی طرف لے جایا جارہا تھا۔میری اہلیہ اور بیٹا اور بھی دو چار لوگ میری طرف لپکے ۔میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھی تک چپکی ہوئی تھی ۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر ان لوگوں کو آہستہ سے خدا حافظ کہا۔پھر فوراً ہی یہ خیال آیا کہ اگر میں واپس نہیں لوٹا تو دو چار دنوں میں ہی قدرت کا مرہم لوگوں کے دکھے دل کا زخم بھر دے گا ۔ گھر کے لوگ میرا آخری سفر نامہ سناتے ہوئے یہ بھی کہیں گے کہ ان کے چہرے پر اس عالم میں بھی کیسی دلکش مسکراہٹ کھیل رہی تھی ۔ وہ دنیا سے کتنے اطمینان اور سکون سے رخصت ہوئے حالانکہ میلی میلی سی اس مسکراہٹ کا سبب شاید یہ تھا کہ خود احتسابی نے میرے کانوں میں چپکے سے یہ کہہ دیا تھا کہ دنیا کے امتحان میں تمہارا پرچہ زیادہ خراب نہیں ہوا ہے۔تمہارے پاس اتنے نمبر ہیں کہ تم داور محشر کو اپنا منہ دکھا سکو گے!

پھر وہ خود اللہ تعالی سے دعا گو ہوتے ہیں کہ:

'' تاب نظارہ جو لائے مجھے وہ دل دینا
منہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا '' !

اس اقتباس میں منور رانا کا اپنوں سے ''خدا حافظ'' کہنا عمومی طور پر خدا حافظ کہنے سے بہت مختلف دکھائی دیتا ہے۔عام حالات میں ''خدا حافظ'' ایک روایتی انداز میں کہا جاتا ہے اس امید کہ ساتھ کہ لوٹ کر واپس آنا ہے۔لیکن زندگی اور موت کے درمیان ہوتی جنگ کے دوران کہیں گے'' خدا حافظ'' میں اپنوں سے ہمیشہ کے لئے دور ہونے کا خوف، اور ناامیدی کی کیفیت صاف ظاہر ہوتی ہے اور آخری وقت کے خود احتسابی کے عمل کو انہوں نے جس طرح بیان کیا ہے وہ واقعی دلوں کو جھنجوڑنے والا ہے کہ انسان بستر مرگ پر ہی خود احتسابی کے عمل سے گزرتا ہے اور خود کو خود کی نظر سے پرکھتا ہے کہ وہ خدا کو منہ دکھانے کے قابل ہے بھی یا نہیں؟ اور جب یہ اعتماد بحال ہوتا ہے تو مندرجہ ذیل قسم کے اشعار موضوع ہوتے ہیں کہ:

میں اپنے آپ کو اتنا سمیٹ سکتا ہوں
کہیں بھی قبر بنا دو میں لیٹ سکتا ہوں

ان کی قبر بنائی گئی لکھنو کے ''عیش باغ'' قبرستان میں جہاں جا کر وہ ابدی نیند سو گئے ۔اور ان سے محبت کرنے والے ان کے ہزاروں مداح روتے ہی رہ گئے ۔ بقول رانا:

''ہم سے محبت کرنے والے روتے ہی رہ جائیں گے
ہم جو کسی دن سوئے تو پھر سوتے ہی رہ جائیں گے''

دنیا سے رخصت ہوتے ہوتے انہوں نے اپنے چاہنے والوں کو نصیحت بھی کی کہ:

''اب جدائی کے سفر کو مرے آسان کرو
تم مجھے خواب میں آکر نہ پریشان کرو''!

ان کی تمنا تھی کہ:

" ایک بار پھر سے مٹی کی صورت کرو مجھے
عزت کے ساتھ دنیا سے رخصت کرو مجھے
مولا یہ تمنا ہے کہ جب جان سے جاؤں
جس شان سے آیا ہوں اسی شان سے جاؤں
ہر لفظ مہکنے لگے لکھا ہوا میرا
میں لکھتا ہوا یادوں کے لوبان سے جاؤں "

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں رانا نے "یادوں کے لوبان" کی جوترکیب استعمال کی ہے۔وہ انفرادی ہے جو بھر پور تخلیقی قوت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ایک وسیع المطالعہ اور زبان کے لسانی نظام پر حاوی شاعر ہی ایک شاعرانہ خیال کو نئی تراکیب کے ساتھ زیادہ موثر اور معنی خیز انداز میں پیش کر سکتا ہے۔

14 جنوری 2024 کی شب کو 71 سال کی عمر میں یہ کہتے ہوئے وہ سپردخاک ہوئے کہ:

"جسم پر مٹی ملیں گے پاک ہو جائیں گے ہم
اے زمیں اک دن تری خوراک ہو جائیں گے ہم"

سینکڑوں سوگواروں نے نم آنکھوں کے ساتھ انہیں الوداع کیا۔مشہور ہستیوں جیسے وزیر اعظم نریندر مودی، کانگریس لیڈر راہول گاندھی، اتر پردیش کے سابق وزیر اعلی اور سماج وادی پارٹی کے صدر اکھلیش یادو کے علاوہ کئی اہم ہستیوں نے ان کے انتقال پر غم کا اظہار کیا۔مشہور نغمہ نگار جاوید اختر نے ان کے جنازے کو کندھا دیا۔

منور رانا کہتے ہیں کہ:

" ہم نہیں تھے تو کیا کمی تھی یہاں
ہم نہ ہوں گے تو کیا کمی ہوگی "!

وہ نہیں تھے تو دنیا ایک عظیم شاعر سے محروم تھی۔جو ہمیشہ اپنے موقوف پر ڈٹا رہا، جو خوابوں کا نہیں بلکہ امیدوں کا شاعر تھا۔ وہ نہ ہوتے تو نہ "بغیر نقشے کا مکان بنتا" نہ ہی "سفید جنگلی کبوتر" کھلی فضاء میں اپنے پر تولتا، نہ ہی "جنگلی پھول" کھلتے نہ ہی کوئی کسی سے کہتا کہ "چہرے یادرہتے ہیں" اور نہ ہی 500 اشعار پر مشتمل "مہاجر نامہ" جیسی طویل ایک پوری جمعیت پر گزری روداد خونچکاں وجود میں آتی۔رانا کا وجود جس مٹی سے اٹھا تھا اسی مٹی میں دفن ہوگیا۔ان کے اس شعر کے مصداق کہ:

" میں اسی مٹی سے اٹھا تھا بگولے کی طرح
اور پھر اک دن اسی مٹی میں مٹی مل گئی " !

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب بندہ زندگی کی آزمائشوں، بیماریوں، پریشانیوں مصائب وآلام سے تنگ آجاتا ہے تو ان سے چھٹکارا پانے کے لئے موت کی تمنا کرتا ہے۔رانا بھی موت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

" اے موت مجھے تو نے مصیبت سے نکالا
صیاد سمجھتا تھا رہا ہو نہیں سکتا " !

افسوس! صد افسوس کہ ایک بلند آہنگ اور حساس ادیب و شاعر اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

" بچھڑ کے بھی محبت کے زمانے یاد رہتے ہیں
اجڑ جاتی ہے محفل اور چہرے یاد رہتے ہیں !

وہ شاعر جو مشاعروں کی کامیابی کا ضامن ہوا کرتا تھا۔جس کے بغیر محفلیں سونی ہو جائیں گی لیکن ایک جرأت مند شاعر کا چہرہ اور کلام ہمیشہ اردوداں اور غیر اردوداں طبقہ کو یاد آتا رہے گا۔ان کی وفات سے نہ صرف اردو زبان وادب کا نقصان ہوا ہے بلکہ ہندوستان کی تہذیب کا نا قابل تلافی نقصان ہوا ہے۔

ہم منور رانا کی روح کے سکون کے لئے دعا گو ہیں کہ :

دنیا سے عقبی کو بہتر کردے
ہر گوشہ لحد کا تو منور کردے
اللہ یہی تجھ سے دعا ہے میری
جنت کو منور کا تو گھر کر دے

(نسیم فائق)

☆☆☆

ڈاکٹر رضیہ دانش۔ پی۔جی۔کونسلر، بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی

منور رانا کی شاعرانہ عظمت

منور رانا کا حقیقی نام سید منور علی ہے، وہ 26 نومبر 1952 کو اتر پردیش کے مردم خیز خطے رائے بریلی میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام سید انور علی اور والدہ کا نام عائشہ خاتون ہے، منور رانا نے اپنی ابتدائی تعلیم شعیب ودھیالیہ اور گورنمنٹ انٹر کالج، رائے بریلی سے حاصل کی، اس کے آگے کی تعلیم کے لئے انھیں لکھنؤ بھیج دیا گیا جہاں ان کا داخلہ سینٹ جانس ہائی اسکول میں ہوا، قیام لکھنؤ کے دوران انھوں نے وہاں کے روایتی ماحول سے اپنی زبان و بیان کی بنیادیں پختہ کیں۔ اس کے بعد ان کے والد نے جو روزگار کے پیش نظر کلکتہ منتقل ہو گئے تھے، انھیں 1968 میں کلکتہ بلالیا، جہاں انھوں نے محمد جان ہائی سیکنڈری اسکول سے ہائر سیکنڈری کی تعلیم مکمل کی اور گریجویشن کی ڈگری کے لئے کلکتہ کے پی امیش چندرا کالج میں بی کام کے لیے داخلہ لے لیا۔

منور رانا کی ادبی شخصیت کو پروان چڑھانے میں لکھنؤ کے ماحول کے علاوہ خاص طور پر ان کے ادب نواز دادا مرحوم سید صادق علی کا گہرا اثر رہا جوان سے عہد طفلی میں دوسروں کی غزلیں باقاعدہ پڑھوایا کرتے تھے تاکہ ادب میں ان کی دلچسپی بڑھے اور انھیں تحریک ملے، جس نے آگے چل کر حقیقت کا روپ دھار لیا۔ شاید اسی ریاضت کا ثمرہ ہے کہ آج بھی منور رانا کو ہزار ہا اشعار ازبر ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے ہی فلم اور شاعری ان کی کمزوری رہی۔ پہلے پہل وہ شاعری سے از حد متاثر تھے لیکن عہد شباب میں اپنے مزاج کی ناہمواری کے باعث ان کی آنکھیں فلم کی مصنوعی چمک دمک سے چکا چوند ہو گئیں۔ لہٰذا وہ فلم کی طرف مائل ہو گئے اور فلم سے وابستگی کی ٹھان لی۔ جس کی شروعات انھوں نے فلمی اداکاروں کی آوازوں کی نقالی سے کی۔ اس عمل میں منور رانا کئی فلمی اداکاروں کی آوازیں نقل کرنے میں ماہر ہو گئے، لیکن فلم اسٹار شتروگھن سنہا کی آواز کی نقل اس حد تک کرنے لگے کہ حقیقت کا گمان ہونے لگا اور انھیں ''کلکتہ کا شتروگھن سنہا'' بھی کہا جانے لگا۔ انھیں دنوں منور رانا نے کچھ افسانے اور منی کہانیاں بھی لکھیں جو کئی مقامی اخباروں میں شائع ہوئیں۔ چونکہ ان کے سر پر فلم کا آسیب سوار تھا لہٰذا وہ ڈراموں کی طرف راغب ہو گئے۔ اس طرح انھوں نے اپنا پہلا ڈراما '' جئے بنگلا دیش'' کلکتہ کے ہومیوپیتھی کالج میں منعقدہ سہ لسانی ڈراما مقابلے کے لیے نہ صرف تحریر کیا بلکہ اس کی ہدایت کاری بھی انجام دی اور جسے انعام یافتہ بھی قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے پرتھوی راج اور آغا حشر کاشمیری کئی ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھائے۔ بالخصوص سچن کمار کی زیر ہدایت آغا حشر کاشمیری کا ڈراما ''آنکھ کا نشہ'' میں بنی پرشاد کے مرکزی کردار میں ان کی اداکاری اتنی پسند کی گئی کہ اس ڈراما کے کئی کامیاب شوز منعقد کیے گئے۔ بالآخر انھوں نے فلم اداکار، ہدایت کار اور پروڈیوسر جوگندر کی ایک فلم ''گیتا اور قرآن'' کے لیے کہانی لکھ کر ہی دم لیا۔ جس کا ٹائٹل اندراج بھی ہوا تھا، لیکن کسی وجہ سے یہ فلم نہ بن سکی، اس ناکامی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کے سر سے فلم کا آسیب ہی اتر گیا اور وہ مغربی بنگال کی تاریخی شاعری کی زندہ روایات کا مستحکم عزم لئے میدان شاعری میں آگئے اور اس فن میں غزل کو انھوں نے اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ گلستان شاعری میں سید منور علی نے خود کو 70-1969 میں قلبی واردات، احساسات اور جذبات کی چنگاری سے ''منور علی آتش'' بن کر متعارف کرایا۔

اس طرح میدان شعر و سخن کے ابتدائی دنوں میں وہ

پروفیسر اعزاز افضل کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے اور ان سے اکتساب فیض کرتے ہوئے اپنی شعلہ بیانی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ہر چند کہ انہوں نے اپنی عمر کے سولہویں سال میں پہلی نظم کہی جو محمد خان ہائر سیکنڈری اسکول کے مجلّے میں چھپی لیکن بحیثیت شاعر ان کی پہلی تخلیق 1972 میں منور علی آتش کے نام سے کلکتہ کے ایک معیاری رسالہ ماہنامہ ''شہود'' میں شائع ہوئی۔ آگے چل کر منور رانا نے نازش پرتاپ گڑھی اور راز الٰہ آبادی کے مشوروں سے اپنا تخلص بدلا اور ''منور علی شاداں'' بن کر غزلیں کہنے لگے۔ بعد ازاں انہوں نے جب والی آسی سے شرف تلمذ حاصل کیا تو ان کے مشورے سے 1977ء میں ایک مرتبہ پھر اپنا تخلص بدلا اور ''منور رانا'' بن گئے۔ اس طرح سید منور علی کو منور علی آتش سے منور علی شاداں اور پھر منور رانا بننے تک پورے نو سال کا عرصہ لگ گیا۔ اس مدت میں انہوں نے مشق سخن جاری رکھی اور اپنی فکر کی پرواز کو اوج کمال تک پہنچایا۔

منور رانا کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ وہ جس موضوع کو اپنے اشعار کے سانچے میں ڈھالتے ہیں اسے بڑی دلیری اور برجستگی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اظہار خیال کے لیے اپنی غزلوں کے الفاظ و بیان میں ملمع سازی سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ اپنی زندگی کے تجربات، حادثات اور عصر حاضر کے مشاہدات کو نہایت سلیقے اور جرأت مندی سے قارئین و سامعین تک اپنے اشعار کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔ شاید یہی خصوصیت ان کی کامیاب شاعری کی ضامن ہے۔ منور رانا کی شاعری کے عمیق مطالعے سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری مقدس رشتوں کی پاکیزگی اور احترام سے عبارت ہے۔ دنیا کے تمام رشتوں میں ماں کے رشتے کو نہایت مقدم اور پاکیزہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ منور رانا کا بھی اس رشتۂ عظیم سے نہ صرف دلی لگاؤ ہے بلکہ گہری انسیت بھی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ محبت کے جذبوں کا اظہار آسان نہیں ہوتا لیکن منور رانا نے اس جذبے کا بھی خوب اظہار کیا ہے اور ہر ممکن موقعہ پر ''ماں'' کے تصور کو نہایت خوبصورتی سے اپنے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے، یہاں اس شعر کا ذکر بالکل بجا معلوم ہوتا ہے جس کے ذریعہ ان کے دل میں ماں کے مقام کا جو تقدس ہے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے کہ لکھتے ہیں شعر ملاحظہ ہو:

کسی کو گھر ملا حصے میں یا کوئی دوکاں آئی
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا میرے حصے میں ماں آئی

منور رانا نے جس کثرت سے اپنی شاعری میں لفظ ''ماں'' کا استعمال کیا ہے ان کے معاصر شعراء میں کسی اور نے نہیں کیا ہے۔ شاعری کے علاوہ منور رانا کی ایک بڑی خصوصیت ان کی تیکھی، دھار دھار، لطیف و دل پذیر اور رواں دواں نثر نگاری بھی ہے، وہ اپنی خدا داد شعری صلاحیتوں کی طرح نثر لکھنے پر بھی ید طولیٰ رکھنے والے ایسے قلم کار ہیں جو انشائیہ اور خاکہ نگاری کے میدان میں بھی اپنے ہم عصر لکھنے والوں سے کہیں آگے ہیں۔

ان کے انشائیوں کے مجموعے ''بغیر نقشے کا مکان''، ''سفید جنگلی کبوتر'' اور خاکوں کا مجموعہ ''چہرے یاد رہتے ہیں''، اردو نثری ادب میں کبھی فراموش نہ کی جانے والی تخلیقات ہیں۔ منور رانا کئی اہم اداروں سے وابستہ رہے اور مختلف عہدوں پر بھی فائز رہے۔ جن میں اتر پردیش اردو اکیڈمی کے سابق صدر، والی آسی اکیڈمی کے چیئرمین اور رکن مجلس انتظامیہ مغربی بنگال اردو اکیڈمی جیسے اہم عہدے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اردو روزنامہ ''مسلم دنیا'' لکھنؤ اور ہندی ہفت روزہ ''جن بیان'' لکھنؤ کی ادارت سے منسلک رہے۔ ان کی مطبوعات میں سب سے پہلے اردو کے شعری مجموعے جن میں ''نیم کا پھول'' (1993)، ''کہو ظل الٰہی سے'' (2000)، ''منور رانا کی سو غزلیں'' (2000)، ''گھر اکیلا ہو گا'' (2000)، ''ماں'' (2005)، ''جنگلی پھول'' (2008)، ''نئے موسم کے پھول'' (2009)، ''مہاجر نامہ (2010)، ''کترن میرے خوابوں کی'' (2010) وغیرہ شامل ہیں۔

ہندی زبان کے شعری مجموعوں میں ''غزل گاؤں'' (1981)، ''پیپل چھاؤں'' (1984)، ''مور پاؤں'' (1987)، ''سب اس کے لیے (1989)، ''نیم کے پھول'' (1991)، ''بدن سرائے'' (1996)، ''گھر اکیلا ہوگا'' (2000)، ''ماں'' (2005)، ''پھر کبیر'' (2007)، ''شادابہ'' (2012)، ''سخن سرائے'' (2012) شامل ہیں۔اردو ادب کے اس عظیم شاعر کی اہمیت کا اندازہ ان کے چند اہم اقوال کے ذریعہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔منور رانا کے اقوال سے چند ایک اہم اقوال ملاحظہ ہو:

''پرہیز دنیا کی سب سے کارگر دوا ہے لیکن سب سے کم استعمال ہوتی ہے''، ''نیند تو اس نازک مزاج بچی کی طرح ہے جو سب کی گود میں نہیں جاتی''، ''تھکن موت کی پہلی دستک کا نام ہے''

''اردو ہندوستانی نسل کی وہ لڑکی ہے جو اپنے سلونے حسن اور مٹھاس بھرے لہجے کی بدولت ساری دنیا میں محبوب و مقبول ہے''

''سچ پوچھیں تو شاعری وہ نہیں ہوتی جسے آپ مصرعوں میں قید کر لیتے ہیں۔ بلکہ اصل شاعری تو وہ ہوتی ہے جس کی خوشبو آپ کے کردار سے آتی ہے''۔

ان منتخبہ اقوال کے ذریعہ یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ منور رانا کی نظر دنیا کو ہر ایک زاویہ سے دیکھنے کا فہم رکھتی تھی، کہیں وہ اردو زبان سے محبت کا اظہار کرتے ہیں تو کہیں شاعری کو خوشبو سے تعبیر کرتے ہیں، ان کے یہاں نیند، بیماری، ڈاکٹر اور پرہیز غرض ہر قسم کے موضوعات پر اظہارِ خیال ملتا ہے جس کے ذریعہ ان کے فہم و ادراک کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

منور رانا کا اپنا تخلیقی جغرافیہ اور اپنا شعری محاورہ ہے۔ان کی شاعری اپنی دعوتی اور اپنا آکاش رکھتی ہے۔ہندوستانی زبان کے رنگ سے بھرپور ان کی غزل ''لوک غزل'' کی مثال ہے، جو ہماری تہذیب اور معاشرت کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔منور رانا کے سخن کے کئی حوالے ہیں، جو ہمیں غزل کے اس تازہ کار شاعر کی امتیازی شناخت کے اسباب تک پہنچاتے ہیں۔ان کے اشعار میں رشتوں کا حسن ہے، وہ ٹوٹتے بکھرتے بشری رابطوں کو جوڑتے ہیں، وہ صارفیت کے اس عہد میں انسانی رشتوں کی قیمت نہیں، قدر طے کرتے ہیں۔محنت کشوں کے پسینے کو انہوں نے اپنے قلم کی روشنائی بنایا ہے۔منور رانا سماجی خرابیوں کے خلاف شکوہ نہیں احتجاج کرتے ہیں۔حق و انصاف کی خاطر اقتدار سے ٹکر لیتے ہیں۔جدوجہد کرتے ہیں۔درد کو محفوظ کرنے والی ان کی غزلوں میں اداسی تو ہے لیکن قنوطیت نہیں۔وہ خوابوں کے نہیں امیدوں کے شاعر ہیں۔منور رانا کی شاعری آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان کے فاصلے کو کم کرنا چاہتی ہے وہ کسی خاص اہتمام سے شعر نہیں کہتے، بس اپنے دل کی بات لکھتے جاتے ہیں۔

منور رانا کی بڑی شناخت یہ ہے کہ انہوں نے بت ہزار شیوہ غزل کو وہ معصومیت اور تقدس بخشا ہے کہ وہ مہذب گھرانوں کی بہو بیٹی بن گئی ہے۔غزل اپنی صدیوں پرانی روایت کے مطابق آج بھی صنف نازک سے مکالمہ کرتی ہے، لیکن یہ صنف نازک صرف محبوبہ کیوں؟ ماں، بیٹی، بہن یا بہو کیوں نہیں؟ منور رانا کی غزل اسی سوالیہ نشان کو تحلیل کرتی ہے غزل سے دو ایک شعر ملاحظہ ہو۔

غزل وہ صنف نازک ہے جسے اپنی رفاقت سے
وہ محبوبہ بنا لیتا ہے میں بیٹی بناتا ہوں
یہ چڑیا بھی مری بیٹی سے کتنی ملتی جلتی ہے
کہیں بھی شاخ گل دیکھے تو جھولا ڈال دیتی ہے

الغرض ان کی شاعری میں جس قدر ماں کا موضوع چھایا رہتا ہے شاید ہی کوئی اور موضوع ہو۔غزل میں ماں کے موضوع کو پیش کر کے منور رانا نے اردو غزل میں مختلف موضوعات کو پیش کرنے کی راہ ہموار کی ہے۔یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے غزل کو ایک محدود دائرے سے نکال کر اس کے کینوس کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے۔منور رانا کے بعد بہت سارے شاعروں نے اس موضوع کو غزل میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

علیزے نجف۔ سرائے میر اعظم گڈھ

ڈاکٹر اسلم پرویز کی ہمہ جہت شخصیت و خدمات (۱)

انسانوں کی اس دنیا میں انسانی صفات کا عنقا ہونا ایک ایسا عام حادثہ بن چکا ہے، جس پر افسوس ظاہر کرنا بھی ایک اضافی عمل کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ انسان کی اصل شناخت ان اخلاق وصفات سے بنتی ہے جس کو وہ شعوری طور پر اپناتا ہے، عہدہ، مرتبہ، رنگ اور نسل وغیرہ اس کی شناخت کی تشکیل میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل تقوی اور اعلی اخلاق کے حامل لوگوں کو بقیہ دوسرے انسانوں پر واضح فضیلت بخشی ہے۔ اس دنیا میں شب و روز ہمارا سابقہ مختلف انسانوں سے پڑتا ہے جہاں کچھ لوگ بہت جلد ہمارے حافظے سے محو ہو جاتے ہیں وہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی جداگانہ صفات اور اعلی انسانی اقدار کی وجہ سے ہمارے ذہنوں پر ایسا تاثر چھوڑ جاتے ہیں کہ وہ شعوری ولاشعوری طور پر ہمیشہ ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں موجود رہتے ہیں۔ میرے لئے ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب ایسے ہی انسانوں میں سے ایک ہیں جن کا مہربان لہجہ اور مشفق رویہ آج بھی میرے ذہن پر ایک انمٹ نقش کی طرح ثبت ہے۔ بات کرتے ہوئے وہ اس قدر انکساری کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ وہی اسلم پرویز صاحب ہیں جو مختلف عہدۂ جلیلہ پر فائز رہ چکے ہیں، ان کے لہجے و الفاظ دونوں ہی سے خلوص اور شفقت کا احساس ہوتا ہے۔ اخلاقی روایتوں کے زوال نے انسان کو ظاہر پرست بنا دیا ہے، اس لئے عہدے اور مرتبے کے حاصل ہوتے ہی اس کی پرواز کا رخ بدل جاتا ہے ایسے میں اسلم پرویز صاحب جیسی منکسر المزاج شخصیتیں کسی گوہر نایاب سے کم نہیں۔

ڈاکٹر اسلم پرویز کا نام علمی و سائنسی دنیا میں کسی کے لئے بھی اجنبی نہیں ان کی شخصیت شش جہت کی تفسیر ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم سرکاری پرائمری اسکول سے حاصل کی پھر اینگلو عربک اسکول میں داخل ہو گئے اس کے بعد دہلی کالج سے بی ایس سی کر کے علی گڑھ چلے گئے جہاں سے ایم ایس سی، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ ان کے تدریسی شغل کا آغاز 1977ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہوا، جہاں سے انھوں نے 1979ء میں نباتیات (Botany) میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تھی۔

انھوں نے تعلیمی میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ذاکر حسین دہلی کالج (دہلی کالج) میں پینتیس سال تک تدریسی خدمات انجام دی ہیں، وہاں کے آپ پرنسپل بھی رہے، طلبہ کی ذہن سازی اور ان کو صحیح فکر فراہم کرنا ہمیشہ ان کی اولین ترجیح میں شامل رہا، انھوں نے اب تک سینکڑوں طلبہ کے ذہنوں کو نہ صرف علم کی روشنی سے منور کیا بلکہ انھیں زندگی کی اعلی قدروں سے روشناس بھی کرایا، اسلم پرویز صاحب ایک استاد ہونے کے ساتھ مربی اور شخصیت ساز بھی ہیں وہ طلبہ کی انفرادیت کے مدنظر ان کی صلاحیتوں کو نکھارنے کی حمایت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب کی تدریس کے تئیں سچی لگن اور جستجو کو دیکھتے ہوئے انھیں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی حیثیت سے تقرری دی گئی۔ پانچ سال تک وہ اس عہدے پر فائز رہے، انھوں نے اس عہدے کے تقاضے اور اس کے اصول و قوانین کو بہت خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا، ان کی یہ اصول پسندی بہتوں کے لئے وجہ تعریض بھی بنی، ان کے نزدیک اشخاص کی دلداری سے زیادہ ادارے کی ترقی اہم تھی اس لئے انھوں نے لوگوں کی بیجا خوشامد کرنے کے بجائے ہمیشہ ادارے کی ترقی اور اصولوں کی پاسداری کو ترجیح دیا انھوں نے اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کرنا کبھی پسند نہیں کیا۔

اردو زبان میں سائنسی مواد کو فروغ دینے والوں میں ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب کا نام ہمیشہ جلّی حروف میں لکھا جائے گا، انھوں نے انتہائی عام فہم زبان میں سائنس کی گتھیوں کو سلجھا کر اسے مضمون کی صورت قارئین کے سامنے پیش کیا، ان کا پہلا مضمون ''قومی آواز'' میں 1982 میں شائع ہوا۔ اُس وقت موہن چراغی اخبار کے ایڈیٹر تھے، وہ سائنس اور ماحول پر مضامین لکھا کرتے تھے۔ جس کو لوگوں نے بہت پسند کیا اور پھر ہر منگل روزنامہ قومی آواز اخبار کے لیے ایک خاص

آرٹیکل لکھنا شروع کردیا یہ سلسلہ طویل عرصے تک چلتا رہا۔انھوں نے متنوع موضوعات پر قلم اٹھا کر سیر حاصل بحث کر کے اس موضوع کا حق ادا کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے جس میں کہ وہ کامیاب بھی رہے،ان کا مزاج بھی بلکل سائنسی ہے وہ کسی بھی بات کو محض عقیدت کی وجہ سے تسلیم کرنے کے قائل نہیں وہ سوال کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی ترغیب دلاتے ہیں کہ وہ غور وفکر کریں اگر کسی شے یا معاملے کی حقانیت مسلم ہو لیکن آپ کے فہم سے پرے ہو تو عقیدت کے غلاف میں سوال کو پس پردہ ڈالنے کے بجائے مناسب الفاظ میں اپنے شکوک وشبہات کو بیان کرنے کی جرأت کریں تا کہ آپ کو شرح صدر حاصل ہو اور علم کی افزائش کا سلسلہ جاری رہے۔سائنس کے موضوع پر ان کی کتابیں ''سائنس کی باتیں''''سائنس نامہ''اور''سائنس پارے''اور ''ماحول کی باتیں'' شائع ہوچکی ہیں جس نے علمی وسائنسی حلقے میں کافی مقبولیت حاصل کی۔اپنے طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی کہ اردو زبان میں سائنسی مواد انتہائی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں،وہ خود آٹھویں تک اردو کے طالب علم رہے تھے بعد میں وہ انگریزی میڈیم میں چلے گئے انھوں نے اپنے عزم واستقلال سے بہت جلد انگریزی زبان پر اپنی گرفت مضبوط کرلی لیکن وہ اردو زبان میں موجود اس خلا کو کبھی بھول نہیں سکے انھیں اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ اردو میڈیم طلبہ کے لئے سائنسی معلومات حاصل کرنا کتنا مشکل ہے اس کے لئے شروع شروع میں تو وہ خود مضامین لکھتے رہے پھر جلد ہی انھیں احساس ہوا کہ اس کے لئے انھیں باقاعدہ ایک پلیٹ فارم کی ضرورت ہے اس کے لئے انھوں نے 1992ء میں ''انجمن فروغ سائنس'' نامی جماعت کو سوسائٹیز کے تحت رجسٹر کرایا اور 1994ء سے ماہنامہ سائنس کی باقاعدہ اشاعت شروع کردی اس کے اولین سرپرست پروفیسر عبدالسلام (نوبل انعام یافتہ) حکیم عبدالحمید اور سید حامد تھے۔فروری 1994 سے یہ رسالہ مستقل نکل رہا ہے۔یہ اردو زبان میں واحد سائنسی رسالہ ہے،جس کا سفر اتنی طویل مدت پر محیط ہونے کے ساتھ آج بھی جاری ہے،ماہنامہ سائنس کی اشاعت کے ابتدائی دنوں میں کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ بہت جلد یہ رسالہ دوسرے سائنسی رسالوں کی طرح بند ہو جائے گا،آج تیس سال سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے بعد اس کی مسلسل اشاعت نے ان کے اس خیال کو غلط ثابت کردیا،اس میگزین کے تحت انھوں نے اہم سائنسی موضوعات کو اردو میں مضمون اور کہانی کی صورت منتقل کیا اور ملک و بیرون میں رہنے والے قلمکاروں کو موقع دیا کہ وہ اپنی اردو سائنس پر مبنی کاوشوں کو اس میگزین میں شائع کرا سکتے ہیں۔اس میگزین کے تمام مضمون انتہائی معیاری اور مستند ہوتے ہیں جو کہ قارئین،خاص طور سے طلبہ کے لئے نہایت معلومات افزاء ہوتے ہیں۔اس میگزین سے متعلق ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب کا کہنا ہے کہ'' یہ صرف ایک میگزین نہیں بلکہ ایک مشن ہے''۔اس رسالے نے لوگوں میں صرف سائنسی شعور ہی کو پروان نہیں چڑھایا بلکہ اردو زبان کی بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہے۔ناچیز کے ذریعے لئے گئے انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا تھا''زبان اور تہذیب استعمال کی چیزیں ہیں اردو کو سب سے بڑا نقصان اردو طبقے کی بے حسی،لاپرواہی اور عدم دوراندیشی نے پہنچایا ہے،علم کی کمی نے ہماری اکثریت کی ذہنی وسعت کو بہت محدود کردیا ہے،اسلام کے نام پہ چند ارکان پہ عمل کر کے اسے دین سمجھ کر وہ قرآن سے بھی دور ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے مال و دولت اور عیش وعشرت ان کے نئے بت ہیں جن کے پیچھے یہ لگے رہتے ہیں اگر انھوں نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہوتا تو زندگی گزارنے کے صحیح طریقے،زندگی کا مقصد اور درست ترجیحات سے واقف ہوتے''۔

ڈاکٹر خلیق انجم (سابق جنرل سکریٹری،انجمن ترقی اردو ہند) ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی کتاب ''سائنس کی باتیں'' پر رائے دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''...اردو والوں میں سائنس کے مختلف شعبوں میں ماہرین کی تعداد بہت کم ہے اور جو ہیں وہ اپنی مادری زبان،اردو کی طرف سے احساسِ کم تری میں کچھ ایسے مبتلا ہیں کہ اردو میں نہیں بلکہ انگریزی میں لکھنا پسند کرتے ہیں۔... اردو زبان میں اسلم صاحب جیسے ذہین،محنتی اور باصلاحیت نوجوان کی آمد پر ہمیں لال قالین بچھا کر ان کا استقبال کرنا چاہئے۔''

بیشک یہ بات صد فیصد درست ہے کہ اردو زبان کو اب احساس کمتری سے جوڑ دیا گیا ہے اور یہاں ہر کوئی ابھرنے ونکھرنے کا خواہشمند ہے ایسے میں وہ اردو زبان کے نام پہ چند شعلہ انگیز تقریریں

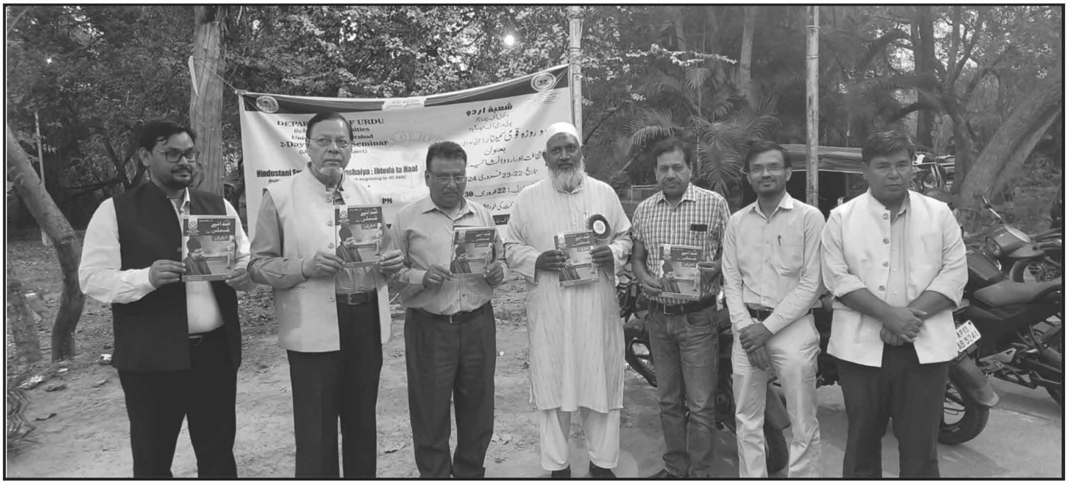

ماہنامہ ’’صدائے شبلی‘‘ حیدرآباد کا خصوصی شمارہ ’’مسرور عابدی‘‘ یونیورسٹی آف حیدرآباد میں مشہور و معروف پروفیسروں کے ہاتھوں میں۔

مشہور و معروف صحافی سماجی جہد کار بنگال کے سرسید ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب کی ڈاکٹر مختار احمد فردین صدر آل انڈیا اردو ماس سوسائٹی فار پیس اور چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی تہنیت کرتے ہوئے۔ اور ماہنامہ ’’صدائے شبلی‘‘ حیدرآباد کی رونمائی کرتے ہوئے۔

تو دے دیتے ہیں لیکن اس کی خدمت کے لئے چنداں فکر مند نہیں، بیشک دوسری زبانیں سیکھنا اس میں معاملات انجام دینا ہماری ضرورت ہے لیکن ایسی بھی کیا کم نظری کہ اردو زبان سے پیچھا ہی چھڑانے کی کوشش کی جانی لگے، اسے دوسری زبانوں کے ساتھ بھی لے کر چلا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز اس کی بہترین مثال ہیں۔ ایک طرف وہ ’انجمن فروغ سائنس‘ کے تحت اردو زبان وادب کا دائرہ وسیع کر رہے تھے اور اس کے ساتھ مارچ 1998ء تا جون 1999ء مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے دہلی ریجنل سینٹر میں تاسیسی ریجنل ڈائریکٹر بھی رہے۔ اس دوران دیگر علمی وسماجی خدمات سے بھی ان کی وابستگی رہی۔ 1994ء میں وہ ’اسلامک فاؤنڈیشن فار سائنس اینڈ انوائرنمنٹ‘ سے تعلیمی/ ماحولیاتی رضا کار کے طور پر وابستہ ہوئے۔ جون 2013ء میں انھوں نے ’مینا قرآنک ایجوکیشن ٹرسٹ‘ کی بنیاد ڈالی اور اب بھی بحیثیت ڈائریکٹر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم پرویز چوتھائی صدی سے زیادہ عرصے سے مسلمانوں میں سائنس اور سائنسی فکر کو فروغ دینے میں شب و روز مصروف ہیں، ان کی رائے کے مطابق سائنسی یعنی علوم کے ذریعے قرآن کی آیات کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے جب تک ہم قرآن کے اصل مفہوم کو نہیں سمجھیں گے مومن ہونے کا حق نہیں ادا کیا جا سکتا۔

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد کا خصوصی شمارہ ''مسرور عابدی'' کی رسم رونمائی و تقریب ایوارڈ

ادبی اجلاس ومشاعرہ کا کامیاب انعقاد

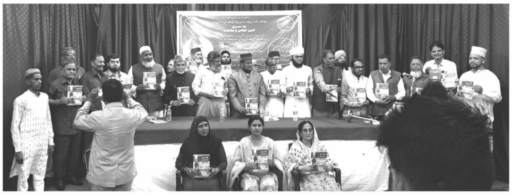

دبستان مسرور کے زیر اہتمام استاذ الشعراء جناب سید شاہ مسرور عابدی شرفی القادری مرحوم کی یاد میں عظیم الشان ''یادمسرور'' ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد کا خصوصی شمارہ مسرور عابدی کا رسم اجراء، تقریب ایوارڈ، ادبی اجلاس ومشاعرہ مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد کی زیر سرپرستی منعقد ہوا۔ صدارت جناب محمد عظمت اللہ جعفری صدر دبستان مسرور نے کی۔ نظامت کے فرائض جناب ظہور ظہیر آبادی نے بہت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ مولانا زعیم الدین حسامی، معتمد سراج العلماء اکیڈمی، پروفیسر مسعود احمد مسعود موٹی ویشنل اسپیکر ڈائریکٹر MIMCS ماہر تعلیم، ڈاکٹر آصف علی نیوز ہیڈ روبی چینل، میر لیاقت علی ہاشمی بانی وصدر بزم ہندوستانی تنظیم جدہ نے مہمانان خصوصی اور ڈاکٹر مختار احمد فردین مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ محفل کا آغاز حافظ وقاری محمد عظمت اللہ جعفری کی تلاوت کلام پاک اور جناب سلیم قادری کی نعت رسولؐ سے ہوا۔ یادمسرور کے نام سے سید شاہ مسرور عابدی شرفی القادری مرحوم کی یاد میں یہ پہلا ادبی اجلاس ومشاعرہ تھا۔ دبستان مسرور کی جانب سے پہلا ''مسرور عابدی ایوارڈ'' 2024 ڈاکٹر مختار احمد فردین کو ان کی اردو ادبی، صحافتی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں تہنیت پیش کرتے ہوئے دیا گیا۔ اور دبستان مسرور کی جانب سے ناظم جناب ظہور ظہیر آبادی نے اعلان کیا کہ آئندہ سال سے دبستان مسرور کے زیر اہتمام عظیم الشان پیمانہ پر سالانہ ''یادمسرور'' کے نام سے تقریب منعقد کرتے ہوئے شعراء وشاعرات ادبا وصحافیوں میں سے منتخب کرتے ہوئے ان کے اردو ادبی خدمات کے اعتراف میں جملہ پانچ ایوارڈ دیئے جائیں گے۔ مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''صدائے شبلی''، حیدرآباد، قاضی محمد عظمت اللہ جعفری، مولانا محمد زعیم الدین حسامی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، پروفیسر مسعود احمد مسعود، قاضی سراج الدین رضوی، جناب سید مجتبیٰ عابدی برادر مسرور عابدی مرحوم نے ادبی اجلاس میں سید شاہ مسرور عابدی شرفی القادری مرحوم کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مسرور عابدی بہت ہی باکمال شاعر کے علاوہ ایک نیک دل انسان خلوص وانکساری کا پیکر اور غلام مصطفیٰ تھے۔ انہیں نظم اور غزل کے علاوہ نعت رسولؐ ومنقبت لکھنے میں مہارت حاصل تھی۔ اور شیریں وپرکشش آواز سے ادبی محفلوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ ان کے چلے جانے سے حلقہ ادب میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔ ادبی حلقوں میں لوگ انہیں برسوں یاد رکھیں گے۔ درمیان تقریب ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کا خصوصی شمارہ ''مسرور عابدی'' کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ دبستان مسرور کی جانب سے تمام مہمانوں کی شالپوش وگلپوشی کی گئی۔ اور مہمان وسامعین کے لئے بہترین عشائیہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ محبان مسرور عابدی کی کثیر تعداد نے شرکت فرمائی اردو گھر مغلپورہ اپنی تنگ دامنی کا شکوہ کر رہا تھا۔ بعدازاں مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ مجلس صدور میں قاضی محمد عظمت اللہ جعفری وپروفیسر مسعود احمد مسعود نے صدارت کی۔ ادبی اجلاس ومشاعرہ کی نظامت کے فرائض جناب ظہور ظہیر آبادی نے بہترین انداز میں نبھائے۔ قاضی محمد عظمت اللہ جعفری، سید مصطفی علی سید، ظہور ظہیر آبادی، شرف الدین ارشد، نورالدین امیر، داؤد حسینی اظہر عبدالرشید ارشد ودیگر نے مسرور عابدی مرحوم کو اپنے کلام کے ذریعے خراج عقیدت پیش کیا۔ زعیم ذومرہ، شکیل حیدر، اطیب اعجاز، نورالدین امیر، پروفیسر مسعود احمد مسعود، ارشد شرفی، شاہنواز ہاشمی، سید نوید جعفری، شاکر گوڈ شاہی، ثناء اللہ وصفی، فاروق ظہیر، سید مصطفی علی سید، محمد شاکر علی، داعی محفل میر مقبول علی مقبول، جہانگیر قیاس، شبیر خان اسمارٹ، افضل عارفی، سہیل وارثی، شرف الدین ارشد، باسط علی رئیس، جدت اسلوبی، عبدالرشید ارشد، میر مظفر علی عدیم، سید داؤد حسینی اظہر، محمد مجیب، محترمہ حناء شہیدی، ڈاکٹر ارچنا پانڈے، ڈاکٹر ممتاز سلطانہ وغیرہ نے کلام پیش کرتے ہوئے سامعین کو محظوظ کیا۔ مسرور عابدی مرحوم کے شاگرد عباس سلیم کا مرسلہ کلام عبدالرشید ارشد نے پیش کیا۔ داعی محفل میر مقبول علی مقبول کے اظہار تشکر پر رات دیر گئے اس تقریب کا اختتام ہوا۔ اور آخر میں صوفی بختیار قادری نے مرحوم مسرور عابدی کے حق میں دعائے مغفرت فرمائی۔

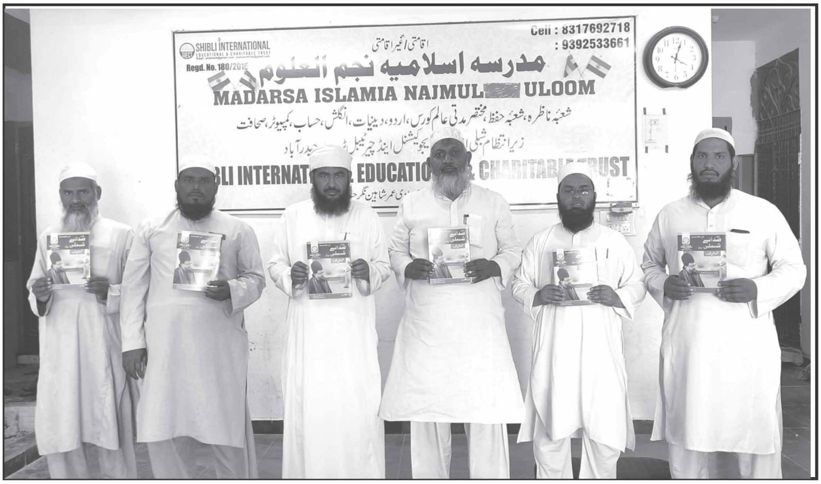

مولانا شمس تبریز مظاہری ندوی کا مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم میں تربیتی خصوصی خطاب

انہوں نے شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدآباد کی خدمات کو سراہتے ہوئے یہ فرمایا کہ آج مدرسوں کو بہت مضبوط کرنے کی ضرورت ہے اور مدرسہ کے طلبہ مہمان رسول ہیں، ان کو احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔تصویر میں ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد کا تازہ شمارہ حافظ وقاری شاکر قاسمی، مولانا محمد بُشیر معروفی قاسمی، ڈاکٹر مولانا محمد محامد ہلال اعظمی ایڈیٹر ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد، مولانا شمس تبریز مظاہری ندوی جھارکھنڈ، حافظ وقاری ناظر ودیگر کے ہاتھوں میں۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر

UNANI CENTER FOR CARDIAC

Consultation Time
Morning: 9:00 am to 2:00 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ، حیدرآباد

SHIBLI INTERNATIONAL
EDUCATIONAL & CHARITABLE TRUST

Regd. No. 180/2016

مدرسہ و مسجد کے تعاون کی اپیل

حدیث نبوی ﷺ ہے خَیْرُکُم مَنْ تَعَلَّمَ القُرآن وَعَلَّمَہ ۔تم میں بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔اس حدیث سے علم اور قرآن علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی علم کی نشرواشاعت کے لئے **مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم** ۱۵؍جنوری ۲۰۱۷ءکو قائم کیا گیا تاکہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے۔آمین یارب العلمین۔

مدرسہ ہذا کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے۔

الحمدللہ مدرسہ میں تعمیری کام بھی جاری ہے،اس وجہ سے اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ مدرسہ کا نقد یا اشیاء کے ذریعہ تعاون فرما کر یا کسی طالب علم کی کفالت لیکر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔نوازش ہوگی۔

مسجدِ الٰھی

زیرانتظام شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کا تعمیری کام جاری ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ ایک مخیرّہ خاتون نے 126 گز اراضی ٹرسٹ ہذا کو مسجد کے لئے وقف کیا ہے، اللہ تعالیٰ مخیرّہ کو دونوں جہاں میں بہترین بدلہ دے، آمین۔ مسجدِ الٰہی کی زمین مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم وادیٔ عمر شاہین نگر حیدرآباد کا (اقامتی وغیر اقامتی) ادارہ ہے، جو شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیرانتظام 2017 سے خدمات انجام دے رہا ہے، بالکل اسی سے متصل ہے۔مدرسہ ہذا اور بستی کے لئے مسجد ناگزیر ہے، اس وجہ سے آپ تمام حضرات سے گزارش کی جاتی ہے کہ مسجد ہذا کے تعمیری کام میں نقد یا اشیاء کے ذریعہ معائنہ کر کے حصہ لے کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔

جزاک اللہ خیرًا احسن الجزاء.

Bank Name : IDBI **A/c Number :** 1327104000065876

A/c Name : SHIBLI INTERNATIONAL EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST

IFSC Code : IBKL0001327. Branch: Charminar

G Pay & Phone Pay : 8317692718, WhatsApp: 9392533661

العارض: حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی وناظم مدرسہ ہذا چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad

Feb. 2024 فروری

RNI: TELURD/2018/77022
ISSN: 2581-9216

Rs. 20/-

ABDUL WAHED
PROPRIETOR
Cell: 98480 36940

For Orders : 90302 02018
86396 32178
89197 03547

KGN XLNT TEA
Rich Aroma, Refreshing Taste
• PREMIUM QUALITY TEA

KGN TEA SALES

UMBRELLA BRAND TEA
Rich Aroma, Refreshing Taste
• GOLDEN QUALITY TEA

WHOLESALE & RETAIL TEA MERCHANT

S.No.: 22-1-114, Jambagh, Kali Khabar Main Road, Dar-ul-shifa, Hyderabad - 500 024, TS
Off.: 5-3-989, 104, First Floor, Sherza Estates, N.S. Road, M.J. Market, Hyderabad - 500 095
email: kgnteasales@gmail.com

Editor, Printer, Published & Owned by Mohd. Muhamid Hilal
Printed at Daira Electric Press, #22-8-143, Chatta Bazar, Hyderabad. 500 002.
Published at #17-3-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex, Dabeerpura, Hyderabad - 23, T.S
Cell: 9392533661, 8317692718, Email: muhamidhilal@gmail.com